چوڑی پچھے

هاجره مسرور

دی بُک کارپوریشن آرام باغ روڈ کراچی

انتساب

اللہ میاں کے دربار سے کچی کچی کلیوں جیسی دو روحیں، ایک فرشتے کو دی گئیں، کہ ان دونوں کو ایک ہی ماں کی مامتا کے سائے میں کھیلنے کے لئے زمین پر بھیجا جائے ہندوستان کے لئے دن رات روحیں ڈھوتے ڈھوتے فرشتے کے ہاتھ مارے تھکن کے سُن ہو رہے تھے۔ ایک روح وہیں عرش پر ہاتھ سے پھسل گئی اور فرشتے کو پتہ نہ چلا۔

یوں ایک اکیلی رُوح زمین کی طرف روانہ کردی گئی، اس روح نے احمد شاہ بنکر مغربی پنجاب کے ایک کوہستانی گاؤں میں انگوٹھا چوسنے اور لوریاں سننے کی ابتدا کی، مگر یہ کچھ عجیب کھوئی کھوئی سی رہتی تھی، جیسے کچھ رکھ کر بھول گئی ہو، بہت سی صبحیں اور شامیں زندگی کے کتنے ہی برس تعمیر کرنے کے کام آگئیں مگر احمد شاہ کی روح کھوئی کھوئی ہی سی رہی۔

اچانک فرشتے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، اور عرش کی وسعتیں چھان ماریں تو وہیں کسی گوشے میں ایک روح پڑی خاک دھول میں اَٹ رہی تھی، وہ خدا کے خوف سے کانپ گیا۔ روح کو اٹھا کر جھاڑا پونچھا۔

اب اللہ میاں کے حکم کی تعمیل کیسے ہو؟ اور پھر یہی ڈر کہ کہیں یہ دونوں روحیں اکٹھی ہو گئیں تو اللہ تک میری لغزش کی شکایت نہ پہنچا دیں اس نے پنجاب کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور روح کو یہ سوچ کر لکھنؤ کی طرف روانہ کردیا۔ کہ یو۔پی اور پنجاب کی نفرت اب انہیں کیا ملنے دیگی۔

اور جب زمین پہ آکر اس نے انگوٹھا چوسنا شروع کیا، تو دادا بولے "میں نے خواب دیکھا ہے اس کا نام احمد نبی رکھو" ماں جل گئیں "بڑے میاں کو تو ایسے ہی خواب نظر آتے ہیں۔ واہ، اسکا

نام تو ہاجرہ ہوگا۔" باپ نے سوچا: "نہیں اس کا نام مسرور ہونا چاہئے" ـــــ ننھی سی جان تینوں ناموں میں گھسٹتی پھری، مگر وہ مسرور تو ہرگز نہیں تھی، عجیب کھوئی کھوئی سی روح تھی، جیسے کچھ رکھ کر بھول گئی ہو؛

اور جب اپنے ابّا کا احمد شاہ، احمد ندیم بن گیا، اور اپنے دادا کی احمدی بی، ہاجرہ مسرور، تو انھوں نے بڑے فاصلے سے ایک دوسرے کو دیکھا اور چونک پڑے، دونوں کی راہ میں دو الگ الگ خاندانوں کی بات ڈٹی کھڑی تھی، صوبائی تعصب ناک بھوں کیڑے دراز تھا، اور جانے کیا کیا الم غلم۔ مگر پھر بھی ندیم بڑھا۔ ہاجرہ اٹھی، اور دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔

"بجی بہن"

"ننو بھیا"

اور دونوں مارے خوشی کے رو پڑے۔

اور وہ دونوں آجتک سوچتے ہیں کہ نہیں اتنی مدت تک کس قوت نے جدا رکھا، اور عرش کے ایک دریچے سے ایک فرشتہ اب بھی کبھی کبھی جھانک کر دیکھ لیتا ہے کہ کہیں اس کی غلطی کی اطلاع اوپر تو نہیں آرہی ہے۔

اور اب اگر میں اپنی کہانیوں کے اس مجموعے کو اس فرشتے کے نام معنون کر دوں، تو کیا حرج ہے، جواب خواہ مخواہی تو پریشان ہے، کیونکہ منزل پر پہنچکر راہ کے کانٹے بھی پھول بن کر یاد آتے ہیں۔

ہاجرہ مسرور

ترتیب

دیباچہ

جب بیسویں صدی پروان چڑھی اور ادیبوں کی فہرست میں کئی عورتوں کے نام چمکنے لگے تو بعض یورپین نقادوں کو جن میں خواتین بھی شامل تھیں، اس سوال نے گدگدایا کہ کیا عورتوں کا ادب مردوں سے جدا ہوتا ہے؟

انسان ہمیشہ سے یہی پوچھتا چلا آیا ہے کہ عورت اور مرد میں کیا فرق ہے؟ جو فرق آنکھوں کو نظر آیا، اس سے مطمئن نہ ہوا۔ بلکہ اس سے تو الجھن اور بھی بڑھی کہ ظاہر کا یہ حال ہے تو باطن میں خدا جانے کتنے فاصلے ہوں گے۔

عورت مرد نہیں بن سکتی، مرد عورت نہیں ہو سکا۔ آدمی دنیا آدمی دنیا سے اجنبی۔ اندھیرے میں ایک دوسرے کو چھوتی اور ٹٹولتی چلی آئی ہے لیکن جب عورتیں بھی ادب کی دنیا میں مردوں کی ہمسایہ بن کر رہنے لگیں تو اندھیرا کچھ کم ہوا۔ کیونکہ ادب سے بڑھ کر ادیب کی فطرت کا مخبر اور غماز کوئی نہیں۔ یہ تو بچہ جننے سے بھی زیادہ پردہ در ہے۔ پہلے پہل تو ادیب عورتوں نے مردوں کی نقل کی گویا اپنے روپ میں سامنے نہ آئیں یا ادب کے کسی روایتی مسلک پر اوروں کے ساتھ ہو لیں۔ جہاں سب فردوں کا بھیس ایک سا ہوتا ہے اور ایک سے دوسرا پہچانا نہیں جاتا۔ لیکن جب خود اعتمادی بڑھی اور سچی سچی باتیں کہنے لگیں تو مردوں سے الگ نظر آنے لگیں۔

ایک جدید انگریزی ناول کی ہیروئن کہتی ہے: "میں ایک عورت ہوں، میری زندگی کیا ہے ایک لمبی مضبوط سی رسّی جو کئی شخصی اور ذاتی رشتوں کے دھاگوں سے بٹی ہوئی ہے۔ بس اس سے

زیادہ کچھ نہیں : عورتوں کے ادب کو غور سے دیکھئے ۔ تو یہ کلیہ کچھ ایسا غلط معلوم نہیں ہوتا۔ ادیبوں کی فہرست میں کئی مرد آپ کو ایسے ملیں گے جن کی روح کائنات کے جنگل میں آسودگی ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ یا انسانی رشتوں کو توڑ کر منہ زور گھوڑے کی طرح سب کچھ پھاند جانا چاہتی ہے۔ لیکن عورتوں کی جذباتی دنیا شخصی اور ذاتی ماحول تک ہی محدود رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب عورتوں نے جو رتبہ افسانہ اور ناول میں حاصل کیا ہے کسی اور صنفِ ادب میں نہیں کر سکیں معلوم ہوتا ہے فطرتِ نسوانی شخصی اور ذاتی رشتوں کے جال ہی میں الجھی رہتی ہے۔ اور یہ جال سب سے زیادہ دلجمعی اور فراغت کے ساتھ ناول اور افسانے ہی میں بُنا جا سکتا ہے۔

شخصی رشتوں کی دنیا محدود سہی لیکن پایاب نہیں۔ اس کی گہرائیاں آفاق کی وسعتوں سے کم نہیں۔ اس لئے یہ نہ سمجھئے کہ عورتوں کا ادب مردوں کے مقابلے میں ہمیشہ دبا دبا رہیگا فطرتِ نسوانی نے پہنائی اور وسعت کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہو، عمق کو اپنے اوپر حرام نہیں کر سکتی۔

یہ خصوصیت یعنی شخصی رشتوں میں انہماک ۔ آپ کو ہماری اکثر ادیب عورتوں میں ملیگی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی فطرت کو جھٹلاتی نہیں۔ بلکہ خلوص اور دیانتداری سے لکھتی ہیں۔ سچ پوچھئے تو اس معاملے میں ان کا نامۂ اعمال مردوں سے زیادہ روشن ہے۔ ہمارے ہاں ادیب عورتوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ لیکن شخصی اور ذاتی رشتوں کی روئیداد جس جرأت اور بیباختگی کے ساتھ انہوں نے پیش کی ہے۔ اس سے ہمارے مردانہ

ادب کو بھی ریاکاری کے گھونگھٹ نکالنے پڑے ہیں۔ اور سب اردو ادب کو ان کی بدولت تازہ ہوا نصیب ہوئی ہے۔

ہاجرہ مسرور کا یہ مجموعہ تازہ ہوا کا ایک اور جھونکا ہے۔ پہلے مجموعوں میں بھی انھوں نے اپنی نسوانی فطرت ہی کو نبھایا ہے۔ یہاں بھی وہ اپنی فطرت ہی کو نبھا رہی ہیں۔ ان کی نظر پہلے سے کہیں زیادہ بلند اور گہری ہے لیکن شخصی اور ذاتی رشتوں کے جال وہ یہاں بھی بُن رہی ہیں۔ انوکھے اور پُر اسرار جال

ان رشتوں کی دنیا بھی ایک حیرت انگیز دنیا ہے۔ اس میں انسان ایک دوسرے کو کھینچتے بھی ہیں اور ڈھکیلتے بھی ہیں اور یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ہاتھ سے کھینچتے دوسرے سے ڈھکیلتے ہیں اور زندگی اس جال میں تنی تنی سی رہتی ہیں شوپن ہاور کا قول ہے کہ "انسانوں کی مثال ان خارپشتوں کی سی ہے جنہیں سردی لگ رہی ہو ٹھٹھرنے لگتے ہیں، تو گرم ہونے کو ایک دوسرے کے قریب سرک آتے ہیں۔ کانٹے چبھتے ہیں تو ایک دوسرے سے پرے ہٹ جاتے ہیں اور پھر ٹھٹھرنے لگتے ہیں۔"

کیا آپ کو یہی نقشہ "آپ ہی کی دنیا کا ذکر ہے کہ ـــــ میں نظر نہیں آیا؟ اس میں شوہر اور بیوی کے درمیان ایک تناؤ اور ایک قرب۔ ایک بیر اور ایک کشش ہے۔ جسے ہاجرہ نے بہت نزاکت سے بیان کیا ہے۔ اس کہانی میں ہاجرہ چھوٹے چھوٹے دبے دبے جذبوں کو اس بے تکلفی سے جمع کرتی چلی گئی ہیں کہ تھوڑی سی

دیر کے بعد منافرت کے اس رینگتے ہوئے سائے سے ڈر آنے لگتا ہے جس قریب خوردگی کو وہ بیان کرنے چلی تھیں وہ شاید کہانی کے آخر میں ظاہر ہوتا ہے لیکن کوئی پڑھنے والا اس کہانی کی اٹھان ہی کو دیکھ کر افسانہ نویس کے فن کا قائل ہو جائے (کہانی کا انجام خواہ کچھ ہی ہو) تو ہاجرہ کو اس پر برہم نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ اسے بھی قدردان ہی سمجھنا چاہئے۔

"کاروبار" بھی ایک شوہر اور بیوی کی کہانی ہے۔ یہاں بھی بیوی کے دل میں احتجاج اور تسلیم ملے جلے پائے جاتے ہیں اور اگر قریب خوردگی نہیں تو ایک بے بسی ضرور ہے۔ لیکن بیوی اسے ظاہر نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اُسے ظاہر کرنا آتا بھی تو نہیں اس الجھاؤ کو میاں بیوی دونوں میں سے شاید کوئی بھی ٹھیک طرح نہیں سمجھ سکتا۔ شوہر کبھی چٹکیاں لیگا۔ کبھی بیوی کی خاموشی سے اُکتا جائے گا۔ بیوی کبھی ہنس دے گی کبھی اس کے آنسو نکل آئیں گے۔ اور ان دو ہم بستر اجنبیوں کی عمر یوں ہی ایک دوسرے سے بے خبر گزرتی چلی جائے گی۔

"ایک بچی" کو آپ محروم مامتا کا افسانہ کہنا چاہیں، تو نہ افسانے کو اس سے انکار ہوگا نہ افسانہ نگار کو۔ لیکن یہاں بھی اس کے علاوہ تعلقات اور رشتوں اور ماحول کی کئی الجھنیں ہیں جن کا حال زاہدہ (ہاجرہ سے پوچھے بغیر) ہمیں سناتی چلی جاتی ہے۔

"مجھے جانے کیوں دبی دبی کیفیت سے نفرت ہونے

لگتی ہے . . . . . گلی کے اس مکان میں رہ کر تو یوں
معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی کہانیوں والی شہزادی ہوں جسے
اُس کے باپ نے ناراض ہو کر جنگل کے قلعے میں
قید کروا دیا تھا . . . . میرے اندر ہی اندر کوئی
اُبھلنے لگا . . . . . میری جوان بہنیں
اور بوڑھی ماں۔ جی میں آیا کہ سب کے پلنگ گھسیٹ
گھسیٹ کر گڈمڈ کر دوں . . . . گلی میں جیسے کوئی
نشے میں لہکتا ہوا گزرا۔ مست اور بے پروا، اور
مجھے ایکدم احساس ہوا کہ میری بانہیں بھی تھک
گئی ہیں۔ پانی بھرتے بھرتے نہیں سینے پر بے کار
پڑے پڑے۔ پہلو میں بے قدری سے رکھے
رکھے اور سر پر بال بناتے بناتے . . . . .“

ایسے جال ہاجرہ بہت ہی پھرتی اور بے تکلفی سے بُن لیتی ہیں۔ تار تار کر کے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کتنی گتھیاں تھیں اس جال میں۔ نہ معلوم ہاجرہ نے بُننے سے پہلے اُنہیں اپنے دماغ میں کیونکر سلجھایا ہوگا اور دھاگوں کے سب پیچ کیونکر یاد رہے ہوں گے۔ اس سلیقے کی اصلی قدر کوئی مشاق افسانہ نگار ہی کر سکتا ہے۔ جو آپ کو بتائے گا کہ یہ کام کتنا مشکل ہے اور ہاجرہ نے اپنے تخلیقی جذبے کی بدولت سے

اپنے لئے کتنا سہل بنالیا ہے۔

اس مجموعے میں کم از کم دو کہانیاں ۔۔۔ "سرگوشیاں" اور "لا علاج" ۔۔۔ ایسی ہیں کہ ہمارے جدید ادب دان پر فخر کرنا چاہئے۔ دونوں کا اسلوب ایک دوسرے سے جدا ہے۔ "سرگوشیاں" ایک کردار کی ایک مسلسل تقریر ہے۔ جو اپنی تیز رو میں ماضی کی باتیں بہا بہا کر ہمارے سامنے لائے چلی جاتی ہے۔ بخار کی سی تیز گفتاری نے کہانی میں ایک بے پناہ قوت، شدت اور حرارت پیدا کر دی ہے۔ جو ہر پیراگراف کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ کہانی کا خطیبانہ انداز شروع میں کھلتا ہے۔ جیسے کوئی۔ "شیر آیا شیر آیا دوڑنا" پکار کر ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہا ہو لیکن جب گیتا کی گزشتہ زندگی کے اوراق ایک ایک کر کے الٹنے لگتے ہیں تو گہرائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں اور قصہ بالآخر دہشت کے کنارے تک جا پہنچتی ہے۔ یہ خطابت کا انداز خطرات سے پر ہے۔ لیکن آفرین کہ ہاجرہ نے باوجود ڈرامائی طمطراق کے کہانی میں کہیں بھی کھوٹ نہیں آنے دی۔ "لا علاج" میں ایک دادی ہے، ایک پوتی دونوں میں سے جسے چاہیں آپ کہانی کا محور سمجھ لیں۔ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہاجرہ نے یہ کہانی پوتی کو سامنے بٹھا کر لکھی ہے۔ لیکن مجھے تو پوتی بھی دادی ہی کی طویل الجھی ہوئی زندگی میں کی ایک الجھن معلوم ہوتی ہے۔ بچپن سے لے کے بڑھاپے تک کے بکھرے ہوئے زندگی کے ٹکڑوں کو ہاجرہ نے ایک مختصر افسانے کی حدود کے اندر اس خوبی اور حسنِ انتخاب سے سمیٹا ہے۔ کہ

اس کی مثال اردو میں مشکل سے ملے گی۔ اگر اردو میں کوئی کہانی، فنی تکمیل، اصلیت اور حساسیت کے اعتبار سے اس رتبے کو پہنچی ہے تو وہ کم از کم میری نظر سے اب تک نہیں گزری اس افسانے میں بڑھیا کرمین کی بھاین بھاین کرتی تنہائی کو دیکھ کر مجھے ایک اور ناول نگار عورت کا ایک کردار یاد آیا جو کرمین ہی کی طرح عمر بھر انسانی رشتوں کا محتاج رہا اور یہی رشتے ایک ایک کرکے اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چلے گئے۔

"اس کی روح ایسی ویران اور اجاڑ تھی کہ اس ویرانی کے مقابلے میں بیرونی ماحول کی کوئی حقیقت ہی معلوم نہ ہوتی تھی۔ تنہائی نے دل میں پنجے گاڑ دیئے اور ایسے معلوم ہوا جیسے سن رسالی کی ایک منہ زور ندی ہے کہ بہے چلی جاتی ہے اور یہ اس کی سطح پر جڑ سے اکھڑے ہوئے درخت کی مانند ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ جڑ اکھڑ چکی ہے اور زندگی کو نہ جانے کون کس وقت پھونک مار کر بجھا دے۔ کہنے کو زندہ ہے لیکن ایک طوفانی سطح پر بے اختیار بہے چلی جاتی ہے۔ آس پاس کوئی ایسی چیز نہیں جسے کمزور انگلیاں پکڑ سکیں۔ پیشتر اس کے کہ منہ پھاڑتی ہوئی لہریں اسے نگل جائیں

..........."

ہاجرہ ہمارے کئی افسانہ نگاروں سے زیادہ حساس اور نازک بیں ہیں۔ ان کی نظر دور تک پہنچتی ہے اور اُن کے افسانوں میں اکثر گہرائیاں ایسی آجاتی ہیں، جو اور افسانہ نگاروں میں نہیں ملتیں۔ ان کی یہ ادا کبھی حساسی سے خالی نہیں کہ ان کے کم از کم تین افسانے حال سے ماضی کی طرف چلتے ہیں۔ جب کوئی انسانی الجھاؤ نہیں، اپنی طاقت سے سلجھتا ہے تو اُن کا ذہن ٹٹولنا شروع کر دیتا ہے کہ یہ الجھاؤ کہاں سے شروع ہوا۔ یہ تجسس حساسی ہی کی ایک انوسٹ کا نام ہے۔ یہی انہیں ماضی کی طرف لے جاتا ہے۔ کیونکہ الجھے ہوئے دھاگوں کے سرے تو اکثر ماضی ہی میں ملتے ہیں۔ ذاتی رشتوں میں جنس کا رشتہ سب سے زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ جنس کا پیڑ ایک ایسا پیڑ ہے جس میں لاکھوں قسم کے کڑوے، میٹھے اور کھٹے پھل لگتے ہیں۔ اور کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جو اسے بوئے گا وہ کیا کاٹے گا۔ اس کی جڑیں، دل اور دماغ اور اعصاب، اور گوشت میں نہ معلوم کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جس نے جہاں تک چیر کر دیکھا نئی سے نئی چیز نظر آئی۔ ہاجرہ کے کرداروں کا جنسی شعور جسمانی مظاہر سے بہت آگے نکل جاتا ہے اور ہاجرہ کے احساس میں کئی نزاکتیں اور پیچیدگیاں ہیں جن کی وجہ سے اُن کے جنسی افسانے اوروں سے زیادہ دقیق اور عمیق معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کے جنسی تعلقات میں تنوع اوروں سے زیادہ ہے۔ اور ان تعلقات کی رنگینی کی زیادہ لطیف اور نگاہ فریب ہیں۔

ہماری عورتیں اپنی خلوت شعاری کی وجہ سے روایتی اور مصنوعی" ادبی"

زبان سے بہت حد تک مامون رہی ہیں۔ چنانچہ جب انھوں نے لکھنا شروع کیا تو جیتے جاگتے الفاظ کے سوا ان کے قلم سے کچھ نہ نکلا۔ ہاجرہ کی زبان کبھی بچی جان زبان ہے۔ جو سیدھی مطلب کی طرف لپکتی ہے۔ اترا۔ اترا کر اپنے آپ کو نہیں دیکھتی رہتی۔ اور اس الھڑپن کی وجہ سے بے تکان وہ باتیں کہہ جاتی ہے جو مصنوعی ادبی زبان کے منشیانہ گلے میں اٹک کر رہ جاتیں یا پھر تکلف سے ادا ہوتیں۔"

لیکن الفاظ کا ذخیرہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو کہنے کی باتیں بہرحال انگنت ہوتی ہیں اور لفظ اکثر ہار ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس لئے ادیبوں کو بار بار استعاروں اور تشبیہوں سے کام لینا پڑتا ہے اور بالآخر ان کے خلوص اور ژرف نگاہی کا پتہ ان کی تشبیہوں ہی سے چلتا ہے۔ کہئے تو ہاجرہ کی تشبیہوں پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

"کوئی ساتھ رونے والا ہوتا تو اپنے آنسو گالوں پر چنگاری بن کر نہیں لڑھکتے۔"

"لگاوٹ بھی کہیں چھپتی ہے؟ جامن ہے کہیں بھی چھپا کر کھائی جائے کمبخت منھ کی اوداہٹ چغلی کھا دیتی ہے۔"

"آپا کی آنکھیں کیا تھیں بس ڈگڈگی تھیں۔ ہم سب بندر کی طرح اس کے گرد ناچتے۔"

"سبھی نقطے مطلب کے نہیں ہوتے۔ تم روشنائی میں ڈبو کر لکھنے بیٹھو اور نب پر زور دے کر کھینچو تو یونہی کتنے ہی بے معنی نقطے کاغذ پر پھیل جاتے ہیں۔"

"محبت مکڑی کا ایک ایسا جالا ہے جو اگر کونے کھدروں میں لگنے پر جسم سے

لپٹ جائے تو لاکھ چھٹانے کے باوجود کہیں نہ کہیں ذرا بہت چپکا ہی رہ جاتا ہے۔"

"تم کہنا چاہتی تھیں کہ تمہیں جو کچھ دیا گیا ہے یہ تو صرف اتنا ہے جیسے کسی کو تحفہ میں بغیر دستے کی کٹار پکڑا دی جائے۔"

"تم تو ایسی ٹھنڈی نظر آرہی تھیں جیسے بنگالی قحط زدہ کے گھر کا چولھا۔"

"اس کے احساسات پر جیسے سڑا ہوا آم نچڑ رہا تھا گھناؤنا، کڑوا رس ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ وہ کوئی بڑا زہریلا جواب دینا چاہتی تھی لیکن اس کے ذہن کے سیتال زہر کا کھولاؤ ہر ڈھلتے ہوئے فقرے کو بھنور میں پڑی ہوئی سیپ کی طرح نچا ڈالتا۔۔۔۔۔"

یہ کتنے مزے کی بات ہے کہ جن لڑکیوں کے لئے فساد ہوتے ہیں یہی چند روز بعد ایسی فضول ہو جاتی ہیں جیسے نارنگی کا چھلکا۔۔۔۔"

"کتنی مشکل سے تو انہیں بات کرنے کا ایک موضوع ملا تھا لیکن انہوں نے تو ایک دوسرے پر تیزاب پھینکنے کی کوشش میں اسے بھی ختم کر دیا۔۔۔"

"مگر وہ دونوں اس سے محظوظ ہونے کا خیال نہیں کر سکتے تھے۔ جیسے دونوں کی زندگی میں سوائے نیم کے کچھ پھولتا ہی نہ ہو۔۔۔۔۔"

"وہ اس کی نظر سے دور ہوتے ہی اپنی ہستی کو اب بے بس اور دردناک محسوس کرنے لگتی ہے جیسے جیٹھ بیساکھ میں ریت کے پہلوؤں میں یہ دبی ہوئی گنگا۔"

"شادی کے بعد ایک سال ایسا گزرا۔ جیسے کوئی ننھی چڑیا چہکتے چہکتے ایک درخت سے دوسرے درخت پر جا بیٹھے۔۔۔۔۔"

"جتنی لمبی عمر ہو، اتنی ہی لمبی اُلجھنیں۔ سوئی میں لمبا دھاگا ڈال کر سینے بیٹھو تو بار بار گتھیاں پڑ جاتی ہیں۔"

ماننا پڑے گا کہ ہاجرہ کی تشبیہیں انوکھی ہیں اور جذبے اور خیال کے ساتھ ہی بے تکلف اُن کے ذہن میں چلی آتی ہیں۔ جس ادیب کو اپنی سوچی ہوئی، اپنی دیکھی ہوئی اپنی بیتی ہوئی بات کہنی ہو، اس کا کام گھڑی گھڑائی تشبیہوں سے کیونکر چل سکتا ہے اور جو گھڑی گھڑائی تشبیہیں استعمال کرتے ہیں وہ اپنے دل کی بات کیونکر کہہ سکتے ہوں گے۔

اس مجموعے میں ایک آدھ مضمون ایسا ہے جسے شاید افسانہ نہ کہہ سکیں۔ میرا بس چلتا تو اُس کی جگہ بھی ہاجرہ کو افسانہ ہی لکھنے پر مجبور کرتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسی چیز کی ضرورت آئندہ کبھی پیش نہ آئے گی۔ اُن کی طبیعت کا اصلی جوہر جو اُن کے تین مجموعوں میں چمکا ہے، انہیں خود افسانہ لکھنے پر مجبور کرے گا اور انہیں افسانہ لکھے بغیر چین نہ آئے گا۔

جب تک اُن کا چوتھا مجموعہ نہ آئے ہمیں بھی چین نہ آئے گا۔

پطرس

ایک بچی

اس دن شام ہی سے پھوار پڑ رہی تھی اور مجھے بس خواہ مخواہ ہی تو اُلجھن ہو رہی تھی ۔ یوں ہر چند سال سے اکثر میری یہی کیفیت رہتی ۔ گھٹی گھٹی ، دبی دبی ، بیزاری اور اُلجھن سی ـــــ اس پر شام ہی سے وہ ہلکی ہلکی پھوار ـــــ مجھے نہ جانے کیوں ہلکی ہلکی ، دبی دبی کیفیتوں سے نفرت سی ہونے لگتی ہے ۔ کہتے ہیں کہ جھما جھم بارش ہو تو سارا پانی مکانوں کی چھتوں سے ندی نالے کی طرح بہہ کر نکل جاتا ہے ۔ لیکن یہ ہلکی ہلکی پھوار تو ایسے غضب کی ہوتی ہے کہ نئے نئے مکان بھی ڈھے جاتے ہیں اس سے ۔

لاکھ کوشش کرنے کے باوجود میں اُلجھتی ہی چلی جا رہی تھی ـــــ جتنی لمبی عمر ہو اتنی ہی لمبی اُلجھنیں ۔ سوئی میں لمبا دھاگا ڈال کر سینے بیٹھو

تو بار بار گتھیاں پڑ جاتی ہیں ۔ میری عمر بھی تو اب پینتیس سال کے لگ بھگ تھی ۔

"سب سو رہے !" میرے سرہانے کھلی ہوئی کھڑکی میں سے سرد ہوا خاموشی سے داخل ہو رہی تھی ۔ اس پر بھی دماغ میں جیسے انگیٹھی سی دہک رہی تھی ۔ رات کا ابتدائی حصہ تھا لیکن میری گلی میں ۔ انسان تو انسان کتے تک گم سم ہو چکے تھے اور مجھے اس وقت یہ سکوت ہمیشہ سے کہیں زیادہ کھل رہا تھا ۔ گلی کے اس مکان میں رہ کر تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی وہی کہانیوں والی شہزادی ہوں جسے اس کے باپ نے ناراض ہو کر جنگل کے قلعے میں قید کروا دیا تھا ۔

لمبے چوڑے کمرے میں برابر برابر سلیقے سے بچھے ہوئے پلنگوں پر میری ماں اور پانچوں بہنیں لحافوں میں گھسی گٹھریاں بنی پڑی تھیں ۔ چپ چاپ لحافوں تلے ڈھیر ، جیسے میری طرح انہیں بھی کوئی الجھن گھیرے ہوئے ہو ۔ ایک کمرے میں قریب قریب پڑے ہوئے پلنگ ۔ جیسے ہم سب قیدی ہوں یا جنرل وارڈ کے مریض ، یا کسی یتیم خانے کے یتیم ۔

بھئی اللہ ! بھئی اللہ ! ! — میرے سر میں جھنک سی ہونے لگی اور جیسے میرے اندر ہی اندر کوئی الجھ کر بچوں کی طرح ٹھنکنے لگا ۔ بھئی اللہ سب سو گئے سب لحافوں تلے دفن ہو گئے — کوئی بھی نہیں بولتا ، کیا یہ سب کے سب

حلق تک روٹیاں ٹھونس کر لیتے ہیں جو ہوں ہاں تک کرنے کی سکت نہیں رہی۔
ہاں کھائیں گے نہیں تو اور کیا کریں گے۔ یہ لگ گویا میری کمائی سے ہی تو حرام کی
—— دن بھر ڈیڑھ سو روپلی کے لئے میں اپنا سر کوٹتا مغز لڑاؤں پیسے بچا کر دیں
اور یہ سب اونگھیں مزے سے حلق تک بھر گئے —— اور دو چچا جان بھی
تو نہیں آئے اب تک باہر سے! یہ حضرت بھی تو کچھ کم خود غرض نہیں ہیں
—— بیچارے اپنے بڑے بھائی کے مرنے کے بعد ان کی بیوہ اور بچیوں
کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ کمبخت باتوں کے چٹکلے، کاموں کے نوار۔ آئیں گے
گیارہ بجے باہر سے! کون اٹھ کر دروازہ کھولے گا۔؟ جیسے سب اُن کے
نوکر ہی تو ہیں۔ بڑے آئے چچا جان کی دم۔ مجبوری ہے جو بھگت رہے ہیں
انہیں۔ جوان جوان لڑکیاں چاہے سارے جہان کی ذمہ داریاں اپنے
سر پہ اٹھائیں مگر بغیر مرد سرپرست کے رہیں تو دنیا باتیں بناتی ہے ——
یقیناً یہ حضرت ہماری برائے نام جائداد کے حساب کتاب میں بھی گڑبڑ
کرتے ہوں گے۔ جبھی تو راتوں کو باہر رہتے ہیں —— بڑھاپے میں جانے
کہاں چھچھوندروں کی طرح چھچھیاتے پھرتے ہیں —— چچی جان کو مرے ہوئے
تیس سال ہو گئے جبھی سے رنڈوے ہیں۔ کہتے ہیں انہیں مرحومہ سے
عشق تھا۔ ہاں ہوگا بھی۔ مرحومہ سے عشق۔ ورنہ روایت ہے کہ چچی جان
زندگی بھر ان کے عشق کی لگام موڑنے کی کوشش کرتی رہیں۔ نوکر یوں

تعویذیں لکھوائیں۔ سینکڑوں عمل پڑھے۔ پھر بھی چوکی کی چوکی رہیں۔ ایک دن بھی یوں نہ بیٹھیں جیسے اپنے گرہ سے خریدے ہوئے تخت پر کوئی بیٹھے۔ مگر بھائی ہندوستانی تو اپنی مردہ پرستی کے لئے مشہور ہی ہیں۔ مرحومہ سے چچا جان کا عشق ہو جانا کچھ عجیب نہیں جبھی تو اسی سوگ میں راتوں کو باہر رہتے ہیں۔ میں بھی مر جاؤنگی تو سب مجھے بھی چاہنے لگیں گے ــــ ہائے کیا لڑکی تھی کہ عمر بھر شادی نہ کی اور باپ کے بعد ماں اور بہنوں کو مردانہ وار سنبھال لیا ــــ بلئی اللہ! اس زندگی سے بہتر ہے جلدی سے مر جاؤں ــــ مگر ابھی تو اٹھ کر دروازہ کھولنا ہے چچا جان کے لئے کیونکہ بوڑھا فیضو مارے آلکسی کے سٹ مار جاتا ہے ــــ اللہ کرے مر جائیں چچا جان ــــ

اور میری الجھن بڑھتی ہی گئی، روزانہ کی یکرنگی اور بے کیفی کا احساس جیسے نس نس میں چبھنے لگا۔ یہی برابر برابر پڑے ہوئے پلنگ اور میری جوان جوان بہنیں اور بوڑھی ماں۔ جی میں آیا کہ سب کے پلنگ گھسیٹ گھسیٹ کر گڈمڈ کر دوں۔ میز پر رکھے ہوئے لیمپ پر اپنا تکیہ کھینچ ماروں۔ اور میز کے نیچے بیٹھی ہوئی پالتو بلی کو اٹھا کر کھڑکی سے نیچے گلی کے سرخ سرخ فرش پر پٹخ دوں۔ تاکہ وہ اتنی زور سے چیخے کہ دور تک گلی کا سناٹا درہم برہم ہو جائے۔ میری بہنیں مجھے دیوانہ سمجھ کر چیخیں مارنے لگیں اور میری اماں اپنی بیٹا صفت بیٹی کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر اپنا سینہ کوٹ لیں۔ مگر میں نے

سوچا، یہ تو ایک فضول سی حرکت ہو گی۔ کیونکہ اس کے بعد پھر یہی گھر ہو گا اور یہی سب کچھ۔ بس ایک ذرا سا ہنگامہ۔ جیسے سنہ ۱۹۴۲ء کی تحریک آزادی کا مذاق۔ جیسے الکشن کے کرتب، جیسے نٹوں کا کھیل۔ جیسے . . .

"بجنی اللہ ———" میرے اندر پھر کوئی پاؤں پٹک کر ٹھنکا

میں نے بیزار ہو کر کروٹ بدلی تو میرے سرہانے صبح کا اخبار کھڑکھڑایا۔ میں نے اُسے کھسوٹ کر پلنگ کے نیچے پھینک دیا، اخبار پڑھتے پڑھتے بھی تھک گئی ——" پاکستان، اکھنڈ ہندوستان —— برطانوی ہندوستان ——" میری الجھن نے ایک نئی راہ سجھائی۔ جی میں آیا کہ بے تحاشہ برطانوی ہندوستان زندہ باد کے نعرے لگاؤں تاکہ میرے پڑوس میں رہنے والے مختلف سیاسی عقائد کے لوگ ایک دم چونک پڑیں اور مجھے منہ بھر بھر کر گالیاں دینے لگیں —— کتنی خوشی کی بات ہو گی کہ ایک بار تو سب کے دل پر ایک سی چوٹ پڑے گی —— ایک ہی سا درد اُٹھے گا ——

مگر میری توبہ! میں کر ہی کیا سکتی ہوں سوائے بستر میں لیٹ کر رات گئے تک الجھنے کے؟ میری زندگی میں کوئی انقلاب نہیں آئے گا —— خارجی نہ داخلی۔ دن بھر لڑکیوں کو پڑھاؤ —— ہندو استانیوں کے متعصبانہ غمزے سہو —— میری ہیڈ مسٹرس

سیاست کی ابجد سے بھی ناواقف ہونے کے باوجود خالص اکھنڈ ہندوستانی ہے۔ مسلمان استانیوں کی خفیہ پاکستانی میٹنگوں میں شرکت کرو۔ وہ میٹنگیں جو پانی پلانے والی حقیر سی کہاری تک کو دیکھ کر خندہ پیشانی سے منتشر کر دی جاتی ہیں۔ گھر آؤ تو ایک ایک کی سنو رات کو ڈرے پڑے بھول بھلیوں میں بھٹکو ـــــ مہینے کی پہلی تاریخ کی مٹھی بھر تنخواہ نمک، مرچ اور آٹا، دال کے حسابات کی نذر کرتے ہوئے گرم کوٹ کی تمنا آئندہ مہینے پر ملتوی کرتے جاؤ ـــــ لعنت ہے۔

گیارہ بجے چچا جان آئیں گے۔ اپنے پلنگ پر بقیہ رات ایڈ اینڈ کر ہماری سرپرستی فرمانے کو، تو اس لئے اٹھ کر دروازہ کھولو۔ چچا جان بقولِ خود خدا سے ڈرتے ہیں۔ اس لئے ہماری سرپرستی کے لئے حاضر رہتے ہیں جیسے حکومت برطانیہ کو مہذب ملکوں کے طعنوں کا ڈر ہے اور وہ نیم وحشی ہندوستان کو نہیں چھوڑ سکتی کہ کہیں یہ ملک پچھلے زمانے کی طرف نہ لوٹ جائے۔ سیاسی جماعتیں الکشن کے دانے پر چونچیں لڑائے ہوئے ہیں۔ اور میں اور میری چھوٹی بہن فاطمہ خواہ مخواہ ایک چندے سے چھوکرے کے لئے سوچ سوچ کر مری جا رہی ہیں۔ وہ چندا سا چھوکرا جسے محبت تک کرنا نہیں آتی

اور جس کی منگنی میرے رشتے کے ایک خان بہادر ماموں کی ادھیڑ عمر صاحبزادی سے ہو چکی ہے —— میں نے اس بات پر دل شکستہ ہو کر بنگال کے ایک ہائی اسکول میں ہیڈ معلمہ کی جگہ کے لئے عرضی بھیج دی ہے اور ناظمہ نے خودکشی کا ارادہ ترک کر کے ایک مقامی اسکول میں معلمہ بننا گوارا کر لیا ہے۔ حالانکہ وہ عورت کے لئے ملازمت کو توہین تصور کرتی ہے —— عجیب مذاق ہے یہ دنیا —— اللہ کرے ساری دنیا میں ایسی بارش ہو جس میں ایٹم بم برسیں —— مگر بھئی نہ جانے امریکہ اور برطانیہ نے ایٹم بم کے راز سے اللہ میاں کو واقف بھی ہونے دیا ہوگا؟

میرے سر کے اندر دھک دھک سی ہونے لگی۔ نہ جانے یہ دھک دھک اتنی پاؤں چلی کیوں ہے۔ کبھی کہیں تو کبھی کہیں۔ کمبخت سارا جسم دھڑکن بن کر رہ گیا ہے —— میں نے اپنا سر اٹھا کر تکیوں پر دے مارا۔

"پنیاں بھرت بھرت بیاں ہاری ——" گی ہے جیسے کوئی نشے میں بہکتا گزرا۔ مست اور بے پروا۔ اور مجھے بھی جیسے ایک دم احساس ہوا کہ میری بانہیں بھی تھک گئی ہیں۔ پانی بھرتے بھرتے تو نہیں ہاں سینے پر بیکار پڑے پڑے، پہلو میں بے قدری سے رکھے رکھے اور سر پر ہالہ بناتے بناتے —— اُن کبھی اچھے

میں جائیں یہ بیہودہ خیالات ـــــ ہاں تو پھر اے اللہ میاں میری عرضی بنگال میں منظور کرا دے ـــــ بس وہاں پہنچ کر اپنی موجودہ ماتحتی کا بدلہ خوب دل کھول کر لونگی ـــــ مچھلی اور چاول ملا کر معتدل بنائی ہوئی غذا کا استعمال کیا کروں گی اور فرصت کے اوقات میں صرف رومانیات پر کتابیں پڑھا کروں گی ـــــ

"اللہ کرے میری عرضی منظور ہو جائے۔

"کھٹ کھٹ ـــــ" دروازے کی زنجیر کھڑکائی جانے لگی۔

"کنجی ہوسے ہوسے کھڑکاتا ـــــ اور آہستہ دھیرے دھیرے آتا۔"

میرے دل میں میرا مرد وہ پھر تلملایا ـــــ مگر دروازہ تو چچا جان کھٹکھٹا رہے ہیں ـــــ کمبخت، اللہ کرے کسی دن ہمارے ہاں ڈاکہ پڑے اور لمبے تڑنگے ڈاکو اس گھر کی ساری عورتوں کو اٹھا کر لے جائیں، پھر چچا جان کو اتنی دیر باہر رہنے کی سزا ملے۔

کھٹ کھٹ ـــــ

لو! جواثی کی نیند آگئی بڑے تینوں کو ـــــ اور کوئی بھی نہیں اٹھتا نہ اٹھے! میں بھی نہیں اٹھنے کی چاہے سردی سے اکڑ کر دم نکل جائے چچا جان کا۔ میری جوتی کی نوک سے ـــــ اور گھومیں آدھی رات تک ـــــ

کھٹ کھٹ ــــــــ

"شرم نہیں آتی کنواری بھتیجیوں کا آدھا دھن رکھتے ہوئے۔ اے کہاں بتائی اتنی رین ؟"

فیضو کو شاید رحم آگیا۔ چچا جان زینہ چڑھنے لگے۔ اور مجھے آنے لگا غصہ۔

"جاگ رہی ہو زاہدہ ؟ ہاں ابھی رات بھی کتنی گئی ہے"۔ چچا جان نے میرے پلنگ کے قریب رک کر کہا۔

"ہوں ـــــ!" میں نے جواب دیا۔

"لو یہ مٹھائی"۔ انہوں نے رومال میں بندھی ہوئی مٹھائی کی پوٹلی میرے لحاف پر پھینک دی اور سب لحافوں میں یکدم کھلبلی مچ گئی۔

"بچیوں کو بانٹ دو تبرک ہے"۔ وہ اوور کوٹ اتارتے ہوئے بولے۔

"بستروں سے سر بلند ہوئے جیسے واقعی سب بچیاں ہی تو ہوں۔

ادھر لاؤ حضرت آپا جانی ؟" تقاضہ ہوا تو مجھے غصہ آگیا اس چھچھورے پن پر۔ میں نے مٹھائی کی پوٹلی اماں کے لحاف پر اچھال دی۔

"کیا نظریات دماغ کو چڑھ گئے آپا جانی ؟" ساجدہ نے حسب عادت ایک بے تکا سا قہقہہ لگایا۔

"نہیں تو —— کوئی بات نہیں —— میں نے اپنی تلخی کو دبا کر کہا۔ میں کبھی کبھی یوں ہی سب سے خواہ مخواہ دبنے لگتی ہوں تنہائی کے حصے بخرے ہونے لگے۔ اور میں لحاف میں منہ چھپا کر لیٹ گئی۔ میری الجھن اس چاؤں بھاؤں میں اور بڑھ گئی اور میں نے طے کر لیا کہ بنگال ضرور جاؤں گی۔ بنگال کا جادو تو مجھ پر چلنے سے رہا۔ اور سُنا ہے کہ بنگال کے مرد تو اتنے بزدل ہوتے ہیں کہ اپنے ہاں کی مشہور اور مقبول پیداوار "بنگال کے جادو" پر بڑی آسانی سے غیر بنگالیوں کا قبضہ گوارا کر لیتے ہیں۔ ہنھ! اپنی چوٹی تو بہت چھوٹی ہے۔ بس اطمینان سے مچھلی بھات کھاؤں گی —— اور —— بنگال کا غذائی قحط تو غالباً ختم بھی ہو چکا۔

"[illegible] —— تم میں سے کوئی ——" چچا جان نے اپنے بستر میں گھس کر پوچھا۔ اور میں ایک دم بستر سے اچھل پڑی اور میری طرح میری سب بہنیں۔ مگر اماں کو جیسے مٹھائی کھاتے کھاتے اونگھ سی آ گئی۔

"دہی لوگی دہی" —— گوری سی گھوسن ہر روز ہمارے گھر

ہیں پوچھ جاتی)

"جی — جی!!" ہم سب یکزبان ہو کر بولے۔

"کسی کال کے مارے بنگالی کی اولاد؟" اماں نے مجا مان کر سوال کیا۔

"ارے نہیں بھابی جان - ان کنگلیوں کی اولاد لے کر کیا کرنا ہے۔؟"

چچا جان کی غیرت پر جیسے حرف آگیا۔

"واہ، آپ قحط کے مارے بنگالیوں کو نیچ سمجھتے ہیں۔ قحط جو جنگ اور سرمایہ داروں کالا یا ہوا ہے؟"

زہرا بالکل پنڈت نہرو کے انداز میں گرجی۔

"مگر جناب کال کے مارے لوگوں کی بےبسی فائدہ اٹھا کر ان کے لال چھین لینا بھی تو انسانیت کی توہین ہے" فاطمہ بھنّا کر بولی جسے گدھوں جیسی سنجیدگی کے ساتھ ہائی اسکول کی طالبہ ہونے پر فخر ہے۔

"اور بھوکے ماں باپ کی گود میں ایک بوند دودھ کے لئے دم توڑتے ہوئے بچے دیکھتے رہنا عین انسانیت ہے" ساجدہ بے تکے پن سے ہنستے ہوئے چلائی - بیچاری کو اپنے پھیلے ہوئے دہانے کی ہنسی بہت عزیز ہے۔

سب کی سب زور سے ہنس پڑیں۔ جیسے کوئی لطیفہ ہی تو ہو گیا ہو۔

"لاحول ولا ــــــــــ!" چچا جان کی میٹھی ہوئی آواز نے سب کو خاموش کر دیا

"تم لوگ تو ہر موقعے پہ اپنا اپنا تصنیف کردہ فلسفہ جھاڑنے لگتی ہو۔"

ساجدہ ہنسنے لگی۔ ناظمہ نے گھٹنے پر ٹھوڑی ٹکا کر جھومنا مناسب سمجھا۔ اور ناظمہ کو اپنے بکھرے ہوئے بالوں میں گرہ دینا یاد آگیا۔ باقیوں نے محض مسکرانے پہ اکتفا کی اور میں جانے کیسے یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ "ایک بچہ ــ ایک بچہ مجھے مل جائے تو" میری نسائیت کی گود میں ممتا ہمکنے لگی۔ "ارے! میں جھینپ سی گئی۔" دھت! خان بہادر کا داماد بن کر مست ہے چند کہیں کا۔ میں تجھ سے کہیں بلند ہوں۔ میں غیر کی اولاد کو بھی اپنا سکتی ہوں۔" کھسیانی بلی کھمبے پر جھپٹی۔

باہر بارش کی ہلکی ہلکی پھواریں ننھی ننھی بوندوں میں تبدیل ہو گئیں اور سائبان پر جیسے کوئی گت بجنے لگی۔

"وہ بچی شریف کی اولاد ہے سمجھیں تم لوگ۔" چچا جان نے زوردار سفارش کی۔

"تمہاری ہی شرافت کا نتیجہ تو نہیں میاں۔" اماں نے ہنس کر چھیڑا تو بھتیجیاں کھلکھلا اٹھیں۔ اور میرے دل میں جیسے سمندر کے کھاری پانی کی ایک لہر سر اٹھا کر لپکی کہ کہیں وہ سچ مچ چچا جان ہی کی ریاضتوں کا پھل نہ ہو

لعنت! تب تو میں گلا گھونٹ دوں کمبخت کا۔ ہاں! ——— چچا جان بوکھلا کر بستر پر بیٹھ گئے۔

"خدا کی قسم آپ تو مذاق کرتی ہیں بھابی جان" وہ سفید بالوں سے ڈھکا ہوا سر جھکا کر شرمائے اور مجھے اس قدر بے تکے لگے کہ میں بھی شرما گئی۔

ناظمہ نے پوچھا "کس کی بچی ہے وہ۔ کیوں چچا جان؟"

"ایک غریب آدمی کی۔ اس کی بیوی کا انتقال پرسوں ہی ہوا ہے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوڑا ہے اس نے۔ دودھ پیتی بچی چھ مہینے کی ہے وہی مل جائے گی" چچا جان اپنے بستر پر دراز ہو گئے "کوئی پرورش کرنے والا نہیں۔ باپ بیچارہ بنئے کا ملازم۔ کہاں بچی کو سنبھالتا پھرے بڑی لڑکی ہے سو پانچ برس کی، اور لڑکا تین برس کا ———"

"لڑکا مل جائے مجھے تو ———" اماں کی حسرت زبان پر آ گئی۔ حد ہے آدھی درجن لڑکیاں اور لڑکا ایک بھی نہیں۔

"لڑکا تو نہیں دے گا وہ ——— اس کی نسل چلے گی اس سے" انہوں نے کاروباری انداز میں ٹکا سا جواب دے دیا اور میں سوچنے لگی کہ سیاسی جھگڑوں میں پڑنے کی بجائے ہمارے لیڈر اس مسئلے کا حل کیوں نہیں تلاش کرتے کہ نسل لڑکی چلاتی ہے۔ یا لڑکا؟

"تو پھر لڑکی لے کر کیا کرنی ہے۔ اور پھر دودھ پیتی بچی ——" اماں کی دلچسپی ختم سی ہو گئی۔

"بڑی لڑکی بھی ملے گی اس کے ساتھ؟" فاطمہ نے بقولِ خود غور بائے (یعنی غور کرتے) ہوئے سوال کیا۔

"نہیں پلی پلائی بچی نہیں دے گا وہ۔ چار دن بعد اُسے گھر میں پکے پکائے کھانے کی اُمید ہو گی۔" انہوں نے جواب دیا۔

"تو پھر کیا فائدہ جب تک بچی کے ساتھ بڑی لڑکی نہ ملے، جو کم از کم بچی کا گو موت تو کر ہی لے گی۔ چند دن بعد اور کچھ نہیں تو گود میں ٹانگے پھرے گی اسے —— بھلا صرف جھیڑ بھیڑ لے کر کون برسوں کی مصیبت مول لے ——" فاطمہ کی دور اندیشی نے اسے لپیٹ کر پھانسنے گردن تک ادھڑ لینے کا مشورہ دیا۔

"میں لوں گی ——" فاطمہ کے مقابلے میں اپنی آواز مجھے کتنی بھلی لگی اور فاطمہ نے گردن اٹھا کر مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ وہی فاطمہ ذرا سی بچی کو پالنے کے لئے تیار ہے جس نے کبھی اپنی چھوٹی بہن کو گود میں اٹھانے کی زحمت بھی نہ کی تھی۔

"میں بھی لے سکتی ہوں۔ کیا قیمت ہو گی؟" فاطمہ پر میرے مقابلے میں ضد سوار ہو گئی —— اور میرے دل پر گھونسہ لگا۔ یہ بہن نہیں سوت ہے

میری۔ یہ بیچ میں آتی تو خان بہادر ماموں کو اتنا جوان داماد نہ ملتا۔ کمینی! کا ہل دوست کے ہونٹوں سے لگا ہوا پانی کا گلاس چھینتی ہے۔

"بھو ہے —— انسان کی قیمت ادا کریں گی امیر زادی" میں نے جل کر کہا گویا دہکتے ہوئے انگاروں پر توا ڈھک دیا۔

"چپ رہو ناظمہ باجی! آپا جانی کے نزدیک انسان کی کوئی قیمت نہیں" ساجدہ نے اپنے مخصوص بے تکے پن سے ہنستے ہوئے بیچ میں پھلجھڑی چھوڑ دی اور میرے مرچیں لگ گئیں۔ جی میں آئی کہ اٹھ کر لگا دوں دو دو تھپڑ ان لڑکیوں کے —— چھوٹی ہو کر ——!

میری ساری آزاد خیالی بے جان سی ہونے لگی۔

"تو بتلایئے چچا جان، ورنہ باجی اور آپا جانی بچی کو نیلام پر چڑھا دیں گی" آمنہ لحاف کے اندر سے چلائی۔

"اس بچی کو پال لو، بس یہی قیمت مقرر کی ہے اس کے باپ نے" چچا جان نے آواز میں رقت پیدا کر کے دلالی کا حق ادا کر دیا۔

"اے اللہ ہمارا ملک! —— اللہ کرے یہاں بھی اشتراکی انقلاب ہو جائے جلدی سے" یہ فاطمہ کی آواز تھی "سب چاٹ ہے بچے اور ان کے والدین۔ ہائے اللہ۔!" اسے اشتراکیت پر عبور رکھنے کا دعویٰ ہر وقت رہا کرتا۔

"اور تمہارا سر ——" زہرہ کی قنوطیت گویا ہوئی "یہاں کچھ بھی نہیں

ہوگا، کچھ بھی نہیں۔ بس پڑی پڑی سوکھو اور اپنے اندر ایک ناکارہ انقلابی کو موٹا کئے جاؤ ——"

"آپ کل صبح بچی کو مجھے دکھا دیجئے —— میں اُس کی پرورش کروں گی"۔ میں نے فیصلہ کن انداز میں اعلان کیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ بنگال جارہی ہوں پینتیس کے لگ بھگ ہوں، صورت بھی ذرا دیسی ہی سی ہے۔ شادی کرنا نہیں یا یوں کہو کہ کرے گا کون مجھ سے شادی۔ یہ بچی مل جائے تو مستقل کنواری رہنے کی شاندار وجہ پیش کر دیا کرونگی۔ اور پھر میرے لئے بھی زندہ رہنے کا کوئی مقصد ہو جائے گا۔ باہر بارش تیز ہو رہی تھی۔

کیا کروگی بچی لے کر؟ تمہارے پالنے کے لئے اتنی بہت سی بہنیں کیا کم ہیں؟" اس نے میری دوڑتی ہوئی گاڑی کے آگے ایک پتھر لڑھکایا۔

"جی!" مجھے رونا سا آگیا" میری بہنیں۔ میں انہیں پالتی رہوں۔ چاہے یہ سب جوتی کی نوک پر بھی نہ رکھیں مجھے میں کسی سے کوئی گلہ نہیں کرتی۔ گر یہ ضرور چاہتی ہوں کہ میرا بھی کوئی ہو۔ میرا اپنا۔ مجھے اس پر بالکل اختیار رہو۔ —— میں چاہتی ہوں —— میں چاہتی ہوں ——" میری آواز تھرانے لگی۔ آنکھیں جل اٹھیں اور کنپٹیاں دل کی طرح دھک دھک کرنے لگیں۔

"ذاتی ملکیت کا جنون انسانیت کو تباہی کے غار میں دھکیل کر رہے گا"۔ فاطمہ جوش کے ساتھ بولی "آپ اس غریب بچی کو اس لئے پالیں گی کہ اس پر آپکو

پورا اختیار ہو ـــــ کارل مارکس کہتا ہے ـــــ"

"چپ رہو مارکس کی نانی" زہرہ بڑبڑائی "آپا جانی ہمیں روپیہ دیتی ہیں، اس لئے ہمیں یوں ذلیل کرتی رہتی ہیں"

"ہاں ہماری بدنصیبی، اس سے پہلے کہ ہم کسی لائق ہوتے ابا مر گئے ـــ خیر اطمینان رکھئے ہم زیادہ دن اپنا بوجھ آپ پر نہیں رہنے دیں گے" آمنہ نے لحاف کے اندر سے زہرہ کے محاذ پر کمک پہنچائی۔

"اپنی چونچ بند کیجئے مستقبل کی استانی جی" فاطمہ جھلا کر بولی۔

"بھئی اللہ! میرا جی چاہتا ہے اپنا سر پھوڑ لوں۔ میری حالت کا کسی کو اندازہ نہیں۔ مجھ سے کسی کو ہمدردی نہیں۔ میں کسی سے اپنا دکھ درد نہیں کہہ سکتی اور اگر کہوں تو سب مجھے نکو بنا لیتے ہیں ـــــ یہ ہے میری قسمت ـــــ" میں پوری یکسوئی سے رونا چاہتی تھی۔

"سچ سچ ـــــ" ناظمہ نے کروٹ بدل لی۔ "اور میرا جی چاہتا ہے اسی وقت خودکشی کر لوں۔"

"تو پھر وہ بچی ـــــ" فاطمہ ...
اسے دیکھ لیجئے آپا جانی"

"ہاں کل اسے لے آؤں گا۔ زاہدہ تم اسے پال لو، بڑا ثواب ہوگا۔ دستوں کی بیماری میں مبتلا ہے۔ علاج ہو گیا تو ٹھیک ہو جائے گی" چچا جان بولے۔

"عذاب ہو جائے گی نگوڑی - جو بھی لے اپنی ذمہ داری پر لے مجھ سے اب بچوں کی چیچا لیدر نہیں ہو گی - صاف بات ہے" اماں نے پھر ایک پہاڑ ڈھکلنے کی کوشش کی : "میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم میں سے کوئی اسے نہیں پال سکے گا - بڑے دل گردے کا کام ہے - بچے پالنا - ابھی تم لوگوں کو شعور ہی کہاں ہے"

"اماں جان! آپ کے ہاں آپا جانی کوئی چودہ سال کی عمر میں پیدا ہوئی تھیں نا؟" فاطمہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ زہر چھڑکتی - اماں تپ کر چپ ہو گئیں۔

"اگر وہ خوبصورت ہو تو آپ ضرور لے لیجیے" ہنسی کے جھٹکوں میں ساجدہ بولی: "گھر بھلا لگے گا بچے سے - میں اس کے لئے اچھی اچھی فراکیں سیوں گی"

"اس کے باپ سے پکے اسٹامپ پر لکھوا لیجیے گا کہ اس نے ہمیشہ کے لئے بچی دے دی - اب اس کا کوئی اختیار نہیں رہا" آمنہ کہنے لگی۔

"اچھا اچھا آنے تو چلنے دو - لڑکی ذات ہے چار دن میں بڑھ کر اس لائق ہو جائے گی کہ گھر کے چار کام کاج کر دیا کرے گی - آپا جانی کے پاؤں دبا دیا کرے گی" زہرہ نے کہا۔

"ہاں بڑھاپے میں کچھ تو سہارا ہو گا ان کا" ناظمہ اپنے سر پر دندناتے ہوئے بڑھاپے کو بھول رہی تھی۔

"لعنت ہے سب پر۔ ایک معصوم بچّی کے لئے بیٹھی غلامی کا جال بن رہی ہیں ساس، سے تو مر جائے وہ۔" فاطمہ چلّائی۔

"اپنی اپنی رائیں محفوظ رکھئے آپ لوگ۔" مجھے ایک دم تاؤ آنے لگا۔

"تمیز بھی ہے بات کرنے کی ——— یہ چچا جان، صبح بچّی کو ضرور لے آیئے۔" میں نے اپنا فیصلہ سُنا دیا۔

"اچھی بات ہے بابا ——— اب سب سو جاؤ۔ رات کافی آگئی۔" چچا جان نے لحاف سے منہ ڈھک لیا اور کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

باہر بارش کا شور بڑھ رہا تھا۔

"میاؤں ——— میاؤں۔" پالتو بلّی میرے پلنگ کے نیچے گھوم گھوم کر گویا چچا جان سے نافرمانی کرنے لگی ——— میں نے اپنا جسم ملائم تکیوں پر گرا دیا۔ ٹھنڈک کی ایک لہر سی جسم میں دوڑ گئی۔

ایک ننھی سی، ہنستی کھیلتی، ہاتھ پاؤں مارتی بچّی میرے احساسات پر چھانے لگی۔ زندگی کی تمام محرومیاں اور ناکامیاں جو کانٹوں کی طرح مسلسل کھٹکتی تھیں۔ اس وقت ذہن میں یوں دب گئیں جیسے تھیں ہی نہیں۔ میری ہنڈیا کھد بد کھد بد پکنے لگی۔ اور میں فاقہ زدوں کی طرح اس کے گرد ناچنے لگی۔

میں اسے لے کر بنگال چلی جاؤں گی۔ ان سب سے دور یہ بہنیں جو

جونکوں کی طرح مجھ سے چمٹی ہوئی ہیں۔ انہیں نوچ پھینکوں گی۔ اس مل سے
دور جسے مجھ سے زیادہ میری کمائی سے محبت ہے، اسے یہیں منہ پھیلائے چھوڑ
جاؤں گی ـــــ اور اس چند خان بہادر کے داماد پر تو لعنت ـــــ میں بنگال
پہنچکر ایک آیا رکھ لوں گی جو خاص طور پر میری بچی کو لئے اسکول میں میرے
سامنے رہے۔ میں ٹھاٹ سے ہیڈ معلمہ کی کرسی پر بیٹھ کر تمام استانیوں
اور لڑکیوں پر حکومت کروں گی۔ اور بچّی آیا کی گود میں لیٹی مجھے دیکھ دیکھ
کر کلکاریاں مارا کرے گی۔ اسکول سے واپس آکر میں تو بس بچّی ہی کے
کاموں میں لگ جایا کروں گی۔ اسے اچھی طرح نہلا دھلا کر خوبصورت
کپڑے پہناؤں گی ـــــ کنگھی کرونگی اور بہت صفائی سے دودھ بنا کر اپنے
ہاتھ سے پلاؤنگی ـــــ میں خود بنگالی عورتوں کی طرح ایک ہلکی سی دھوتی
میں اپنا پورا جسم لپیٹ کر، بال کھول کر، ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پہ بیٹھی اس کا
پالنا جھلایا کروں گی ـــــ "چندا کا پالنا، کرنوں کی ڈور" ـــــ آہا! بیٹیا
موسیقی کی لہروں میں بہتی پرسکون نیند کے خوبصورت جزیرے میں پہنچ
جایا کرے گی۔ اور میں اس کے ننھے ننھے ہونٹوں پر مچلتی ہوئی معصوم مسکراہٹ
دیکھ کر مسکرانے لگا کروں گی۔ سچّی اور ممتا سے مملو مسکراہٹ ـــــ
آہ! ـ رات کو میں اسے اپنے پہلو میں لٹا کر لوری دیا کروں گی، آجا ری
نندیا تو آجا ذرا، بٹیا کو میری سُلا جا ذرا ـــــ وہ میرے سینے سے لپٹی

آنکھیں جھپکا جھپکا کر مسکراتی ہوئی سو جایا کرے گی۔ زلفِ بنگال کی سی سیاہ راتوں میں جب کوئی خواب دیکھ کر چونکوں گی۔ تو میں تنہا نہیں ہونگی۔ بلکہ وہ میرے سینے سے لگی ننھی ننھی سانسیں لے رہی ہوگی۔

آہ میرے اللہ! ـــــ اور پھر میری ننھی تھوڑے دن بعد بولنے لگے گی۔ میری باتیں سمجھنے لگے گی۔ میں ہنسوں گی تو وہ قہقہے لگائے گی۔ میں روؤں گی تو وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھے گی۔ جب کبھی میں کچھ سوچ کر چپ ہو جایا کرونگی تو وہ میرے چہرے کو اپنے نرم نرم ہاتھوں میں دبا کر اپنی فکرمند آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال کر وجہ پوچھا کرے گی اور میں اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا کروں گی۔ "میری ننھی! میری بچی! کوئی بات نہیں۔ کوئی بھی بات نہیں۔ کتاب اٹھا لاؤ میں تمہیں پڑھاؤں" اور میری ننھی نہایت ذہانت سے فر فر اپنا سبق پڑھ ڈالا کرے گی ـــــ اللہ!

میری ننھی مجھے مل جائے اللہ!

میرا دل مارے خوشی کے زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"سنو جی تم لوگ!" میں نے سر اٹھا کر مارے خوشی کے سب کو اپنا اونچا مکان دکھانا چاہا۔" میں بچی کو صرف اس لئے لے رہی ہوں کہ اسے اپنی بچی سمجھوں۔ سمجھیں تم لوگ؟ خواہ وہ کالی کلوٹی ہو۔ خواہ اس کا نقشہ باورچی خانے میں بکھرے ہوئے جھوٹے برتنوں کی طرح ہو۔ میں اسے

ماں بن کر پالوں گی - میں اُسے اپنے ساتھ بنگال لے جاؤں گی - میری زندگی اب اس کے لئے وقف ہے ؟ میرے منہ کے نعرے آسمان کو چھونے لگے -

" ہوں ! ——— ہوں ! " میری بہنیں اس طرح ہوں ہوں کرنے لگیں جیسے کہانی سن رہی ہوں -

" تم لوگ مجھے کیا سمجھتی ہو ؟ کیا میں اتنی قربانی نہیں کر سکتی اس بچی کے لئے ؟ " مجھے غصہ آگیا -

" ہیرا ——— ہیرا " ساجدہ نے تالیاں بجائیں -

" بد تمیز کہیں کی ——— کمینی " میری زبان مارے تاؤ کے اینٹھ کے رہ گئی -

" زاہدہ ! " اماں نے پکارا -

" کہئے ؟ " میں نے جھٹ پٹ کو کہا -

" بچی سے محبت کر دو گی - اس کے لئے زندگی وقف کر دو گی تو دنیا کیا کہے گی ؟ اماں کے لہجہ میں بزرگانہ سختی تھی -

" کیا کہے گی دنیا ——— میں پروا نہیں کرتی - ہاں " میں نے ساری دنیا کو جوتی کی نوک پر رکھ لیا -

" پروا کیسے نہیں کرو گی جب دنیا کہے گی کہ تمہاری ہی حرامی بچی ہے

پڑھی لکھی لڑکیوں کا نام ویسے ہی بدنام ہے" وہ کہنے لگیں۔

اٹا اڑا دھم ــــــ میرا سکان ڈھے گیا۔

ریل چھوٹ گئی۔ میں خالی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ اور کانوں میں انجن سنسنا رہا تھا۔

میں چپ ہو گئی "میں اسے اپنی بچی سمجھوں گی اور کہوں گی۔ لیکن کوئی اور کہہ دے گا تو ــــــ کوئی اور یہی سمجھے گا تو ــــــ میں تو ڈوب مروں گی میرے کنوارے پن پر تو خواہ مخواہ کلنک لگ جائے گا ممکن ہے بنگال میں کوئی میرا منتظر ہو ــــــ ممکن ہے ــــــ مگر یہ حرامی بچی کا ٹیکہ دیکھ کر کس میں ہمت ہے کہ مجھ سے شادی کرے؟" شادی کی دبی ہوئی خواہش نے بھرپور وار کیا۔

بھئی اللہ! ــــــ بھئی اللہ ــــــ میں پھر الجھنے لگی۔

باہر سپوار گر رہی تھی ــــــ

آپ ہی کی دُنیا کا ذکر ہے کہ ......

ان دونوں کے درمیان تپائی پر رکھا ہوا برقی پنکھا، خواہ مخواہ بڑا مضحکہ خیز سا لگ رہا تھا۔ وہ کمر جھکائے احمقوں کی طرح آہستہ آہستہ اپنی منڈیا اس کی طرف لیجاتا اور "سرررر —— پھرررر —— بھن بھن" ایک لمحے ٹک کر پوری قوت سے ہوا دیتا اور پھر اسی مضحکہ خیز آہستگی اور وقار سے اس کے شوہر کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ سررر — پھررر —— بھن بھن۔ جیسے وہ پنکھا نہ ہو، بلکہ کوئی شاہ صاحب ہو، جو منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر، پھونکیں مار مار کر جن اتار رہا ہو۔ کسی پر سے۔ مگر ان دونوں پر تو واقعی ایک بڑا زبردست جن سوار تھا جو کسی طرح اترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا —— دوپہر کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ دونوں نڈھال سے آرام کرسیوں پہ ڈھیر، ایک دوسرے کو اچٹی اچٹی

نظروں سے کبھی کبھی دیکھ رہے تھے۔ ایسی اچٹی اور جلی بھنی نظر بلکہ اگر ان کی عینکوں
کے شیشے چٹخ جاتے تو کچھ عجب نہ تھا۔ ان کی صورتوں سے ایک نہ ختم ہونے والی
بیزاری اور اکتاہٹ برس رہی تھی اور کرسیوں پر وہ ایسے ڈھیلے ڈھالے پڑے
تھے جیسے تھکن نے ان کا جوڑ جوڑ توڑ دیا ہو — اس غضب کی خاموشی چھائی
ہوئی تھی ان پر جیسے بیچاروں کو بولنا آتا ہی نہ ہو، یا پھر اب ازدواجی زندگی کے
دو سال بسر کر لینے کے بعد ان کی کترنی جیسی زبانیں آنکھوں میں اتر آئی ہوں، اور
وہ اپنی زبانوں کے اس نئے ملبوس سے مطمئن ہوں — مگر سچ تو یہ تھا کہ شادی کے
پہلے ہی سال میں وہ اپنے خوبصورت، نازک اور میٹھے الفاظ کی ساری جمع جتھا
خرچ کر بیٹھے تھے۔ رہے معمولی الفاظ تو وہ دوسرے سال میں صرف ہو گئے۔
اور اب تیسرے سال میں جلے کٹے اور کڑوے الفاظ کا تہ خانہ بھی خالی ہوتے دیکھ
کر "کم خرچ کرو" کی پالیسی پر کاربند ہو گئے تھے — ہائے رے یہ جمع خرچ کا پھیر!
کتنی دیر سے تو وہ اسی طرح پڑے ہوئے تھے، ٹھنسے ہوئے معدوں اور بوجھل روحوں
کو محسوس کرتے ہوئے، اور نیچے ان دونوں کے درمیان دبی کمر جھکا شاہ صاحب
معلوم ہو رہا تھا جو کسی کا جن اتارنے کی کوشش کر رہا ہو۔ لوہے کے جھولے میں
پڑا ہوا ادھ کھلا بچہ سوتے میں بار بار منہ بسور رہا تھا، شاید وہ نیند میں اپنے گھر کی
بے رونقی کو محسوس کرتے ہوئے ہنگامے کے لئے آمادہ ہونا چاہ رہا ہو —

دفعتاً برابر والے فلیٹ میں ہڑبونگ سی مچ گئی۔ اس کے چہرے پر

تجسّس کی ایک لہر سی ابھری ساس نے غیر ارادی طور پر اپنے شوہر کی طرف دیکھا
جو خود بھی آوازوں پر کان لگائے ہوئے تھا۔ بالکل بچوں کے سے چاؤ سے
ہمسائی مسز ولیم اس وقت بغیر آواز بنائے زور زور سے کہہ رہی تھی: "تم سالا
ہمارا پانچ برس کا چھوکری سے مسخری کرنا مانگتا؟ تمارے کو اپنا مدر سسٹر نہیں ملتا؟
ہم تمارا پولیس میں رپورٹ لکھوائے گا جو اب ہمارا چھوکری کو چاکلیٹ دے
کر اپنا روم میں لے گیا، سالا" مسز ولیم کڑک کڑک کر اور نہ جانے کتنی دھمکیاں
اس ماں بہن نہ منتخب کرنے والے کو دیتی رہی اور جواب میں ایک بھاری سی
آواز منمناتی رہی جیسے اس بھاری سی آواز کو یہ احساس ہو کہ اگر پانچ برس کی
چھوکری کی جگہ اٹھارہ برس کی لڑکی ہوتی تو دیکھتیں میری آواز کی کڑک اور
اپنی آواز کی منمناہٹ۔

ایک دوسرے کو دیکھ کر وہ بیک وقت بڑے طنز سے ہنس پڑے، جیسے
انہیں ایک ہی وقت میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں کوئی بہت گندی ڈھکی
چھپی بات، ایک دم ننگی نظر آ گئی ہو۔ اس کے شوہر کے چہرے پر حقارت آمیز
ہنسی گہری ہی ہوتی گئی۔

"فضول ہی تو جھک جھک کر رہی ہے کمبخت، کچی کیری دیکھ کر منہ میں پانی
بھر آئے تو خطا کس کی؟ بھلا اس معاملے میں درخت کو کیوں بُرا لگے؟" اس
نے اپنی پتلی پتلی، سیاہ بالوں سے بھری ہوئی ٹانگیں میز پر رکھ دیں اور

ہونٹ لٹکا کر بولا۔ لیکن وہ شاید اس غیر متوقع حملے کے تیار نہ تھی۔

"تھو تھو۔ مرد کی اوقات پر تھو ہے" نفرت سے منہ سکیڑ کر وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ اس کی آنکھوں میں حقارت ابل پڑنے کو تلملا رہی تھی۔

"اس میں چڑھنے کی بات ہی کیا ہے؟ کیری حرام تو نہیں" وہ اسی اکڑ سے کہنے لگا "جبکہ آم کھلانے کے لئے خود درخت بے چین رہتے ہیں"

"بس بھوک! بھوک!! کیریاں چبا لو، پتے ٹھونس لو، درخت نگل جاؤ، پھر بھی اللہ کرے گا پیٹ نہیں بھرے گی مرد ذات کی" اس نے نفرت اور حقارت کا ہر انداز مجتمع کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کھسیانی بلی!" وہ کتے کی طرح غرایا "تم مجھے قائل کر سکو تو جانوں کہ کیریاں اپنے لئے نہیں ہوتیں"

"ہوتی نہ ہوں۔ سنا نہیں مسز ولیم نے کیسے دانت کھٹے کئے تمہارے بھلائی بندکے" وہ ذرا فخر سے مسکرائی "اچھا ہے۔ ایسوں کو تو چوراہے پر سزا ملنا چاہئیے"

"ہاں! ہاں ـــــــــ" وہ چڑ کر بولا "کیری کے لئے تو یہ قیامت ہے اور جو رس بھرا پکا آم راہ چلتے پر ٹپک پڑے تو درخت کیا چپ چاپ کھڑا رہتا ہے، جیسے سانپ سونگھ گیا ہو غریب کو" وہ بڑی بے رحمی سے ہنسا۔

وہ ایک لمحے کو ہق دق رہ گئی۔ مٹھی بھر بھر خاک جو دوسرے
کی طرف اچھال رہی تھی، ایک ہی پھونک میں الٹی اپنے منہ پر پڑ گئی۔

اس کے باپ نے دونوں کی مرضی دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھوں
شادی کر دی تھی۔ یہ تھا اس احسان کا بدلہ! اور آج اسے محبت کرنے کا
صلہ بھی مل گیا۔ وہ اس پہ ٹپک پڑی تھی —— ٹپک پڑی تھی! اس کے
احساسات پہ جیسے سڑا ہوا آم سخپڑ رہا تھا، گھناؤنا کڑوا رس ٹپ ٹپ
گر رہا تھا۔ وہ کوئی بڑا ہی زہریلا جواب دینا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے ذہن
کے سیال زہر کا کھولاؤ ہر ڈھلتے ہوئے فقرے کو بھنور میں پڑی ہوئی
سیپ کی طرح پچھاڑ ڈالتا۔ وہ چپ کی چپ رہ گئی۔

"فساد کی جڑ!" اب کے وہ ذرا خوش مزاجی سے ہنسا۔ "مقولہ تو واقعی
بڑا پرانا ہے مگر اتنا ہی سچا بھی ہے۔ اب دیکھو ہمارے دیس میں فرقہ وارانہ
فسادات کے سوا جتنے بھی فساد ہوتے ہیں، ان میں زیادہ تر لڑکیاں وجہ ہوتی
ہیں۔ لڑکی چاہے اٹھارہ برس کی ہو یا پانچ برس کی۔ فرق صرف اتنا ہے
کہ چھوٹی لڑکیوں کے لئے ڈنکے کی چوٹ پر، اور بڑی لڑکیوں کے لئے عموماً
ذرا نیچے سروں میں۔" بات ختم کر کے وہ اس طرح ہنسا جیسے اس نے کوئی
بڑا اہم مسئلہ بڑی قابلیت سے بیان کیا ہو۔ لیکن وہ آنکھیں جھکائے،
ہونٹ کاٹتے ہوئے، ساری کی پلیٹوں سے کھیل رہی تھی۔ اس کی ننھی

سی کھڑی کھڑی ناک پر لالی تاک جھانک کر رہی تھی اور اسے بار بار تھوک نگلنا پڑ رہا تھا۔

"کیوں میں غلط کہتا ہوں؟" اس کے شوہر نے اُسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں!" وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی: "لیکن کتنے مزے کی بات ہے کہ جن لڑکیوں کے لئے فساد ہوتے ہیں وہی چند روز بعد ایسی فضول ہو جاتی ہیں جیسے نارنگی کا چھلکا۔" وہ اتنے زور سے ہنسی کہ عینک کے شیشوں کے پیچھے نمی چمک اٹھی۔

اس کے شوہر کو شاید بیوی کی یہ ہنسی کھل گئی، جبھی تو اس کی موٹی موٹی بھویں ایک دوسرے پر رہ رہ کر لپکنے لگیں۔ بڑی کوشش سے وہ ہنس سکا، بڑی بیزار اور پھیکی سی ہنسی، جیسے گلے پڑا ڈھول بجا رہا ہو غریب سا!

اس کے بعد ان دونوں کے درمیان بات چیت کا یہ خاردار رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ اتوار کا دن ان سے کاٹے نہ کٹ رہا تھا۔ کتنی مشکل سے تو انہیں بات کرنے کا ایک موضوع ملا تھا، لیکن انہوں نے تو ایک دوسرے پر تیزاب پھینکنے کی کوشش میں اُسے بھی ختم کر دیا۔ اب پھر، چپ — وہی سکوت، وہی بھری ہوئی طبیعتیں اور وہی پنکھے شاہ کی پھونکیں، جو اس حالت میں خواہ مخواہ مضحکہ خیز معلوم ہو رہی تھیں۔

مگر وہ دونوں اس سے بھی محفوظ ہونے کا خیال نہیں کر سکتے تھے، جیسے دونوں کی زندگی میں سوائے نیم کے کچھ پھولتا ہی نہ ہو۔

"سلویا! سلویا ڈارلنگ!" لڑنے جھگڑنے سے چھٹی پا کر مسز ولیم گلے سے ڈھلی ہوئی آواز میں اپنی پانچ برس کی بچی کے لئے کو کنے لگی، جو شاید لڑائی کے دوران میں موقع پا کر کسی اور فلیٹ میں چاکلیٹ کا چسکا پورا کرنے کھسک گئی تھی۔ جانے کیا عادت تھی اس کی کہ ہر ایک کا دروازہ جھانکتی پھرتی بلبلوں کی طرح کبھی کبھی تو ان کے دروازے میں سر اٹھا کر بڑی بڑی خواہشمند آنکھوں سے اندر دیکھنے لگتی۔ اس وقت اس کے شوہر کی نظر کسی غیر شعوری جذبے کے تحت دروازے کی طرف اٹھ گئی مگر کمبخت سلویا واقعی کسی اور ہی گھر میں چاکلیٹ وصول کر رہی تھی۔ اس نے منہ پھاڑ کر ایک جماہی لی اور بڑی سستی سے انگلیاں چٹخاتے ہوئے بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ خاموش تھی، ڈھیلے ڈھالے اعصاب اور دبے دبے غصے نے اس کے چھوٹے سے زرد اور نازک چہرے پر ہلکی سی سوجن دوڑا دی تھی، اور پنکھے کی ہوا نے بگڑے سنورے خشک بالوں کی کئی ننھی ننھی لٹوں کو پیشانی پر لٹکا دیا تھا۔ عینک کا سیاہ فریم تو اور بھی بھلا لگ رہا تھا چہرے پر۔ ایسی پیاری لگ رہی تھی جیسے کوئی نویلی استانی، کوڑ مغز لڑکیوں سے گھبرائے بیٹھی ہو۔ لیکن اس کے شوہر کی آنکھ میں پسندیدگی کی کوئی لہر نہ ابھری۔

"سلویا بڑی ہو کر قاتل نکلے گی قاتل!" اس کے شوہر نے بالوں سے بھری

بولی ہم تکیمیں بدتمیزی سے نہ کر کے آرام کرسی پر جماتے ہوئے کہا، اور پھر دانت دبا کر آنکھیں سکیڑ کر، بے ساختہ ہنسی کے ہلکے ہلکے جھٹکوں سے محفوظ ہونے لگا گویا اُسے تپا رہا ہو۔

اُس نے آنکھیں آہستہ سے اُٹھائیں۔ اس کی نظر اپنے شوہر کے اس بے ہودہ اندازِ نشست پر چند لمحوں کو رُکی، اس اندازِ نشست پر جسے دیکھ کر ہر دفعہ نفرت کی خارِشت، محبت کے ادھ موئے جسم میں نیا ایک اور کانٹا پیوست کر دیتی۔ اسے ایسے موقع پر ہمیشہ اپنا وہ چچا یاد آجاتا جو کرسی پر اسی طرح گھٹنے پیٹ سے لگا کر بیٹھتا تھا، اور اسے دیکھ کر مارے نفرت کے اس کا جی متلانے لگتا تھا۔ مگر وہ کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ کیونکہ وہ بھتیجی تھی لیکن اسے کیا اُمید تھی کہ اُس کا شوہر جس کے عشق میں وہ کبھی بولائی بولائی پھرتی تھی، وہ بھی اسی طرح کرسی پر بیٹھنے کا عادی ہوگا۔ اس نے کتنی ہی بار اسے ٹوکا بھی تھا لیکن جواب ملتا کہ بیوی کے سامنے بھی آرام سے نہ بیٹھا جائے تو پھر کس کے سامنے؟ مگر اسے کیا کیا جائے کہ بیوی کے اندر سے وہ اٹھارہ برس کی، کسی کے عشق میں بولائی بولائی پھرنے والی لڑکی کسی طرح نکلنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ مارے نفرت کے اس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ اس نے اپنے شوہر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ وہ کچھ دن سے اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ وہ محض اسے جلانے اور چڑانے کے لئے ایسی باتیں کرتا ہے۔ ورنہ اس میں کسی عورت سے تمیز

چھاڑ کرنے کی ہمت ہی نہیں۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے شوہر میں چاہے
سب عیب ہوں مگر وہ کچھ تو مجبوراً اور کچھ طبیعتاً پاکباز واقع ہوا ہے۔ تو پھر وہ ان بانی
ہوں سے کیوں ڈرے ؟ وہ خاموش رہی لیکن اس کی نظریں بار بار بالکل غیر ارادی
طور پر سخت کراہت سے اس کی تہ کی ہوئی سوکھی سوکھی ٹانگوں کی طرف اٹھ رہی
تھیں، جن کے درمیان سے کمر بند کا پھندنا نکل کر اس کے نیچے جھول رہا تھا۔

جواب نہ پا کر اس کا شوہر کسی قدر ناگواری سے چھت کی طرف دیکھتے
ہوئے گھٹنے ہلانے لگا۔ اور وہ کھڑکی سے باہر آسمان کے نیلے ڈھکنے کو تکتے ہوئے
سوچتی رہی تھی۔ کچھ اپنی گزشتہ حماقتوں کے بارے میں، جو پہلے حماقتیں نہ محسوس
ہوتی تھیں بلکہ زندگی کا سب سے ضروری اور سب سے حسین مقصد ——
اسے آج سے ساڑھے تین سال قبل ایک شرمیلے سے کم گو کنوارے سے محبت
ہو گئی تھی۔ نہ جانے کیوں اور کیسے ہو گئی ؟ بس، کئی راتیں تخیلات کی مرگوشیاں
سنتے سنتے آنکھوں میں کٹ گئیں، دنوں میں بڑا چکیلا سا اضطراب بھر گیا،
تو اسے یقین ہو گیا کہ اب بجائے موٹی موٹی کورس کی کتابوں اور اپنی عینک
سے محبت کرنے کے وہ اپنے پڑوسی کنوارے کو چاہنے لگی ہے۔ جو اس سے
بھی زیادہ موٹے شیشوں کی عینک لگائے اکثر کسی موٹی سی کتاب سے آنکھیں
لڑائے، بالکونی میں بیٹھا نظر آتا۔ اور وہ اپنی بالکونی میں بار بار آ کر کوئی نہ کوئی
چیز اتنی زور سے رکھتی یا اٹھاتی کہ وہ پڑھنے سے چونک کر اسے دیکھتا اور پھر

شرما کر بڑے غور سے کتاب پڑھنے کیا کھانے لگتا۔

اور ایک دن تو اس کی ایک بے تکلف کلاس فیلو نے اچانک بالکونی میں آکر اس کی مصروفیت بھانپ لی۔

"تو نے مٹھائی بھی نہیں کھلائی۔ کمبخت؟" اس نے اسے دبوچ لیا۔

"ایں ــــ مٹھائی؟" ہڑبڑا کر وہ اسے کمرے میں ڈھکیل کر لے گئی "کیسی مٹھائی؟"

"آنکھیں آٹھ کرنے کی خوشی میں نگھی بوا!" اس نے دونوں کی عینکوں پر پھبتی کسی۔

"اوں ــــ بھئی اللہ ــــ ہم نہیں" اور وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر جھینپی ہوئی ہنسی ہنسنے لگی۔

اپنی دوست کی زبان سے اپنے دل کی ڈھکی چھپی بات سنکر تو اسے پختہ یقین ہو گیا کہ وہ محبت کر رہی ہے۔ یہ احساس گویا اس کی سیدھی سادی سپاٹ زندگی پر جادو کی روائتی لکڑی کی طرح گھوم گیا۔ اب تو زندگی میں پھول گردنیں مٹکاتے کلیاں کھلکھلاتیں۔ تاریک سے تاریک گوشوں میں جیسے جگنو دیا بتی کرتے، اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جسم کو گرم کر دیتی۔ میٹھی میٹھی غنودگی ارد گرد ناچتی اور وہ بند کی گیتوں کی بذہن ملیے روئیں روئیں میں ریشم کے لمس کی سی گدگدی محسوس کرتی

آخر یہی گدگدی اسے اظہار کے قریب لے آئی۔ شوخیاں ہوئیں، اشارے ہوئے، مسکراہٹیں مچلیں، آنسو تڑپے اور بس ——— گہرے رنگوں کے سوٹ ان دنوں کیسے آنکھوں میں کھبتے تھے کہ نظر ہٹانے کو جی نہ چاہتا۔ بھاری آواز سے ڈھلتے ہوئے الفاظ کتنے لوچدار تھے ایسا لوچ تو بس آندری کی کلائیوں ہی میں دکھائی دیتا ہے۔ باتیں ایسی نرم اور پاکیزہ کہ تازے تازے مکھن کا خیال بھی ہٹنے میں میلا دکھائی دینے لگے۔ وہ یہ سب دیکھتی یا اُستانی جی بننے کے لئے کتابوں سے آنکھیں لڑاتی؟ دھڑسے میٹرک میں فیل ہوگئی۔ اور باپ پر جیسے اوس پڑ گئی لیکن ماں نے شان سے کہہ دیا کہ یہ نسائیت کی توہین ہے کہ عورت اپنی جوانی کا ایک بڑا حصہ ڈگریاں حاصل کرنے میں صرف کر دے باپ اپنی آزاد خیال بیٹی کی زبان سے پرانے زمانے کی باتیں سنکر گم سم ہو کر رہ گیا۔ لیکن اُدھر تازے تازے مکھن کے تصور اور آندری کی کلائیوں کے لوچ کے علاوہ بھی وہ کچھ زیادہ بے چین رہنے لگی۔ بھولا بچہ چوسنی سے کب تک بہلے؟ وہ اس کی نظر سے دور ہوتے ہی اپنی ہستی کو ایسا بے بس اور دردناک محسوس کرنے لگتی جیسے جیٹھ بیساکھ میں ہنسنے کے بھوروں میں دبی ہوئی کلی آخر دم توڑ رہی ہو کہ شرمیلے کنولے نے اس کے باپ سے نسبت کی بات چھیڑی، جواب نرم سروں میں ملا۔ اپنے دام کھوٹے ہونے کا احساس ہی لگ رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہنستے چہروں اور لبھورتے دلوں نے ان دونوں کو میاں بیوی ہونے کا سرٹیفکیٹ

عنایت کر ہی دیا۔

شادی کے بعد ایک سال ایسا گزرا جیسے کوئی ننھی چڑیا چہکتے چہکتے ایک درخت سے دوسرے پر جا بیٹھے۔ لیکن پھر تو چڑیا کو دانے دُنکے کی تلاش میں زمین پر اترنا ہی پڑتا ہے ——— اور آج وہ شادی کے تیسرے سال میں تلملائی ہوئی سی اپنی موجودہ زندگی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ بالکل اندھی ہو کر، اپنی اس زندگی کے لئے جس میں سے رنگینی کا ایک ایک قطرہ اس طرح اس کا ہنی نچوڑ چکا تھا۔ جیسے دوہی ہوئی بکری کا بچا کھچا دودھ اس کا بھوکا بچہ چوس لے۔ لیکن جب بھوک نہ ختم ہو تو خالی تھنوں کو گھسیٹے، نوچے اور ٹھوکے دے، پھر بھی کچھ حاصل نہ ہو تو جھنجلا کر بری طرح اُسپھلے، کودے اور ممیائے۔ تو وہ بھی اس گگری کے پیچھے پڑی ہوئی تھی، جس میں کبھی تھوڑا بہت رس تھا۔ وہ رس اپنے حلق میں انڈیل چکی تھی اور اب گگری خالی ہو چکی تھی۔ لیکن وہ ضدی بچے کی طرح گگری کو لڑھکا رہی تھی، اُلٹ پلٹ رہی تھی، کیونکہ وہ اپنے شعور کو رس ختم ہو جانے کے تکلیف دہ احساس میں مبتلا کرنے سے کانپتی تھی۔ لیکن اس وقت اس کے شوہر نے ٹیک پڑنے کا طعنہ دے کر اسے اپنے قریب سے بہت دور ڈھکیل دیا تھا اس گھر سے بے تعلق اور مریل بدصورت بچے سے بیگانہ کر دیا تھا۔ وہ بچہ جسے وہ اپنی بیزاریوں کے باوجود کسی وقت ناممتا سے سینے سے بھینچ لیا کرتی تھی

اب وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے ایک نہایت غلیظ غلطی کی جس کے نتیجے میں وہ یہ سب سن رہی ہے اور دیکھ رہی ہے۔ کاش ـــــ کاش وہ میٹرک ہی پاس کر لیتی تو ـــــ

ٹن ٹن ـــــ کلاک نے بارہ بجائے اور اس کا شوہر کونے میں سجے ہوئے ریڈیو سیٹ کی طرف دیکھ کر اٹھنے لگا۔

"ریڈیو؟" وہ ایک دم جیسے چونک پڑی۔ "ریڈیو۔ دیکھو ریڈیو نہ بجانا! ہاں ـــــ"

"کیوں؟" اسے جیسے مرچیں لگ گئیں۔

"وہ تمہارا لڑکا جاگ کر پیں پیں شروع کر دے گا" وہ تیزی سے بولی۔

"میری جان مصیبت میں پڑ جائے گی، تمہارا کیا بگڑے گا؟" اس کا جی بیاہ رہا تھا کہ اس وقت بات بڑھ جائے۔ اور وہ اپنے جی کی بھڑاس نکالنے لگے۔

"خوب کہی جناب نے" وہ ڈھیلے ڈھالے پائنچوں کا پاجامہ پھٹکارتا ہوا، ریڈیو کی طرف بڑھا جس سے اس کی کمر کا ہلکا سا جھکاؤ اور دبلا پن اور بھی واضح ہو گیا۔ پھیکے تبسم کے ساتھ مڑ کر بولا "نرالی ماں ہو تم تو ـــــ تم سے ایک بچہ بھی نہیں سنبھل سکتا تو پھر ہو کس کام کی؟ کیا وہ دن نہیں

کے تیر مجھ پر صرف کرنے بھر کی ؟" اور وہ جھک کر ریڈیو کے کان مروڑنے لگا۔ کتنا صاف اور صریح طنز تھا اس چھیڑ میں۔ اسے اپنے سینے کے اندر کوئی شے سلگتی محسوس ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ چیخ اٹھے۔ مگر ریڈیو کی گھڑ گھڑ نے تو جیسے اس کی سانس کو دھوئیں کی کوٹھری میں مقید کر دیا تھا۔

اب آپ فلم چاند کا ایک ریکارڈ سنیئے، "سمجھے تھے جسے اپنا ——"

اناؤنسر نے ایسی گرج دار آواز میں اعلان کیا کہ کمرہ دہل گیا، اس کا شوہر اس پھیکی مسکراہٹ کو ہونٹوں سے چپکائے دوبارہ اسی انداز سے اپنی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ ریڈیو پر کسی نے بڑی ہی دلکش اور حسرتناک آواز میں شکوہ کرنا شروع کر دیا۔ "سمجھے تھے جسے اپنا نکلا ہے وہ بیگانہ"

جھولے میں پڑے ہوئے خوبصورت والدین کے بدصورت بچے نے کسمسا کر رونا چاہا، لیکن سونے کا موڈ غالب تھا۔ اس لئے صرف منہ بنا کر رہ گیا۔ اس نے غصے بھری نظروں سے بچے کو گھورا کہ آخر وہ سو کیوں رہا ہے؟ اس وقت تو اسے رونا چاہیئے تھا، گلا پھاڑ پھاڑ کے، مٹھیاں بھینچ بھینچ کے، یہاں تک کہ اسے اچھو ہو جاتا، لیکن وہ اسے نہ اٹھاتی تاکہ اس کا شوہر جو آرام سے بڑا گانا سن رہا تھا، ذرا کرا ہونے پر خوب ہی تلملاتا، اس سے لڑتا، اُسے برا بھلا کہتا اور پھر وہ اسی سلسلے میں کوئی فیصلہ کر لیتی، اپنے باپ کے گھر چلی جاتی یا پھر سمندر میں کود کر جان دے دیتی، بس کوئی بڑا جذباتی سا

فیصلہ ـــــ تاکہ اس سلگتی ہوئی زندگی سے چھٹکارا مل جاتا، لیکن بچہ کمبخت بھی اپنے باپ کی طرح اس کے جذبات کا لحاظ کئے بغیر سوئے چلا جا رہا تھا مارے کلساہٹ کے اُسے رونا آنے لگا۔ ناک کی ننھی سی پھنگی لمز کر لال پڑ گئی اور ہونٹ نیلاہٹ پکڑنے لگے۔ اس نے کچکچا کر اپنے شوہر کی طرف، ایک بار دیکھا وہ آنکھیں بند کئے گانا سن رہا تھا۔ بڑے اطمینان سے آنسو پی کر وہ تلملائی ہوئی اٹھی اور بالکونی میں چلی گئی۔ کیونکہ اس کی نسائیت اب اس دور سے گذر چکی تھی جہاں آنسو دکھائے جا سکتے ہیں۔

بالکونی کی رنگین جالی سے لگ کر وہ جیسے پھوٹ پڑی۔ دوپہر کی گرم ہوا بہتے ہوئے آنسوؤں سے مس ہو کر اس کے تپتے ہوئے رخساروں کو ہلکی سی طمانیت بخش رہی تھی بھیگی بھیگی پلکوں کو پپوٹوں سے چپٹائے وہ لمبی چوڑی صاف ستھری گلی میں ہر طرف دیکھ رہی تھی، اوپر، نیچے اور دور، دور ـــــ ایسی حسرت سے جیسے اس گھر سے باہر کی دنیا اس کے لئے نہ ہو۔ عام لفظوں میں اس کے شوہر نے اسے آزادی دے رکھی تھی یعنی وہ بغیر برقعہ کے تنہا بھی باہر جا سکتی تھی، لیکن اس موقع پر بھی اسے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے یہ دنیا، اتنی بڑی دنیا اس کے لئے نہیں۔ وہ محض ایک قیدی ہے، جس کی نمائش کسی گلی یا کسی سڑک پر کبھی کبھی ہو جاتی ہے۔ ڈھکا ہوا سر، سکڑے لب، نیچی نگاہیں۔ اسے ہر شخص کی نظر ایسی معلوم ہوتی تھی

کہہ رہی ہو کہ "تم فلاں کی بیوی ہو، فلاں کی بیوی" قدم قدم پر جراُت، وہ گھبرا کر جلد سے جلد گھر لوٹ آنا پسند کرتی۔ شادی کے پہلے سال میں نفروں کی یہ پکار اسے کتنی بھلی معلوم ہوتی تھی کہ وہ فلاں کی بیوی ہے مگر اب ــــــ گلی کے اختتام پر چلنے والی ٹراموں کی کھڑکھڑاہٹ اور سائیں سائیں، موٹروں کے ہارن اور سڑک پر چلنے والوں کی آوازیں ہوا اپنے دامن میں بھر بھر کر اس کے گرد بکھیر رہی تھی۔ جیسے اسے للچا رہی ہو۔

گھر میں پڑے پڑے، دنیا کی تگ و دو سے الگ ہو کر عورت کی زندگی کا مقصد صرف محبت رہ جاتا ہے۔ رنگین الفاظ اور چاؤ چونچلے سے سجی ہوئی محبت کی خواہش ــــــ پہلے تو یہ اسے فراوانی سے ملتی ہے۔ لیکن کچھ دن بعد وہ نو روشوں کی محبت مرد کی خارجی زندگی کے جھمیلوں میں الجھ کر رہ جاتی ہے کیونکہ مرد کے پاس زندگی کے بہت سے اعلیٰ معیار ہیں، لیکن عورت کے پاس لے دے کے یہی محبت، جس کے لئے وہ ایک فرماں بردار بیٹی ثابت ہو سکتی ہے، ایک سعادت مند بہن کے روپ میں ظاہر ہو سکتی ہے، ایک فرسٹ کلاس فرسٹ آنے والی طالبہ بن سکتی ہے، ایک اچھی باورچن، ایک اچھی درزن، ایک لائق منتظمہ اور ایک رنگین تتلی بھی ہو سکتی ہے، لیکن یہ سب کس لئے؟ کسی کی نظر میں محبوب بن جانے کے لئے ــــــ

وہ باپ کی خدمت اس لئے کرے گی کہ باپ اس کے لئے جلدی سے

ایک چاہنے والا مرد ڈھونڈ نکالے، بھائی خوش ہو کر اپنے حلقۂ احباب میں اس کا تذکرہ کر دے، وہ پڑھنے میں اس لئے محنت کرے گی کہ کچھ نہیں تو سننے والے اس کی ذہانت سے متاثر ہو کر اسے پوجنے لگیں۔ کھانا عمدہ پکانے میں بھی اس کا یہی جذبہ کام کرے گا، گھر کو بنانے سنوارنے میں بھی وہ اپنے سلیقے کی نمائش کا خیال نہیں بھولے گی، اور ایک رنگین تتلی کی طرح تفریح گاہوں، جلسوں اور پارٹیوں میں اڑتے پھرنے میں بھی اس کا وہی ایک مقصد ہوگا۔ آخر ایک چاہنے والا بمشکل جھپٹ کر شوہر بنا لیا جاتا ہے، وہ چاہے عورت خود جھپٹے یا باپ بھائی جھپٹ کر دے دیں ـــــ بس گویا زندگی کی معراج ہو گئی۔ لیکن کب تک ـــــ؟ آخر بے چاری عورت کے پاس محض جھلاہٹ اور نہ پوری ہونے والی خواہشیں ہی رہ جاتی ہیں۔ قید کا احساس اس پر مستزاد۔ ڈرپوک طبیعتیں، اپنے آپ کو گھونٹ لیتی ہیں، لیکن اس کی جیسی تیز فطرت اُبلنے کی ضد کرنے لگتی ہے۔

شوہر صبح اٹھا، نیند کے خمار میں چور، کچھ جھلایا جھلایا سا۔ بیوی نے کھلایا پلایا اور شوہر کام پر جانے کے لئے ذرا بنا ٹھنا۔ بیوی کے دل میں اسے بنا ٹھنا دیکھ کر چاؤ پیدا ہی ہوا تھا کہ کمبخت ٹھیک وقت پر پہنچنے کا خیال بیچ میں سوت کی طرح آ گھسا۔ لو ادھر اوس کے چند قطروں سے پیاس کیا بجھتی؟

دن بھر انتظار کیا، شام کو شوہر آیا تو مارے تھکان کے پست، چہرے پر مسامات کا چھوڑا ہوا تیل چپڑا ہوا، آنکھیں بے رونق، ہونٹ خشک، ڈھنگ کے کپڑے جسم سے اتر کر، الماری یا کھونٹی سے ہم آغوش ہوگئے اور پھر وہی ڈھیلا ڈھالا پاجامہ جس میں کمر کا جھکاؤ اور دبلاپن بے طرح آنکھوں کو تکلیف دے، بس! بیزاری کا سانپ بیوی کے دل پر کنڈلی مار کر اپنی زہریلی زبان لپلپانے لگتا۔ سنگھار کس کے لئے کرے انتظار کس کا کرے جب کوئی اُسے دیکھ کر بشاش نہیں ہو سکتا، اس کے لئے بن سنور نہیں سکتا ـــــ؟ بیوی نے کڑھتے کڑھتے انچھر پھلانگے، جلی کٹی کہیں، جلی کٹی سنیں، زندگی کیا تھی بس بالکل کچھوے کی پیٹھ۔

اور اب وہ سخت اکتا کر رو رہی تھی، اسے صرف اپنی ذات سے ہمدردی تھی، ایسی شدید ہمدردی جس کی رو میں وہ اپنے شوہر سے اور اپنے بچے سے دور بہہ رہی تھی۔ بالکونی کی ٹھنڈی جالی اس کے نرم ہاتھ سے مس ہو رہی تھی اور یہ ٹھنڈک دھیرے دھیرے اس کے جسم میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ روتے روتے وہ سامنے کے دو منزلہ پرائیویٹ نرسنگ ہوم کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی جس کی کھلی ہوئی سفید کھڑکیوں میں گہرے نیلے رنگ کے پردے لگے، پردہ داری کی قسم کھا رہے تھے، خصوصیت سے بیواؤں اور غیر شادی شدہ لڑکیوں کے اطمینان کے لئے آٹھ ماہ قبل وہ بھی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اپنے شوہر کے کندھے سے لگی اس نرسنگ ہوم میں داخل

ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں ان دنوں اس کے شوہر کو اس کا بہت، خیال رہنے لگا تھا۔
مگر جب وہ ایک بدصورت اور دائم المرض بچے کو لے کر اپنے فلیٹ میں واپس
آئی تو جیسے اس کے شوہر کی بوڑھی سی محبت بالکل ہی اونگھ گئی تھی ـــــــ

یوں ہی دیکھتے دیکھتے اس کی نظر نرسنگ ہوم کے باورچی خانے والی کھڑکی پر
جم کر رہ گئی۔ سوکھا سہما خانساماں کھڑکی کے قریب کھڑا بڑے انہماک سے گردن
کا میل چھڑا رہا تھا کہ اتنے میں نرسنگ ہوم کی ایک ادھیڑ عمر آیا، باورچی خانے میں
داخل ہوئی۔ خانساماں کھڑکی کے قریب سے ہٹ کر آیا کے قریب پہنچ گیا اور پھر
تو وہاں خالص مغربی طریقے پر محبت شروع ہو گئی۔ اس کی نظر نیچی ہو گئی۔ وہ
آیا نرسنگ ہوم میں گھنٹوں اس کے پاس بیٹھ کر خوبصورت اور جوان نرسوں
کی عیاشی کا کچا چٹھا بیان کر کے اپنے پچکے گالوں پر توبہ تلا کی مشق کیا کرتی تھی۔
لیکن آج وہ خود ـــــــ

محبت ـــــــ محبت! اس کی رگوں میں جھنجھناہٹ سی دوڑ گئی اور دماغ
گونج اٹھا۔ شاید اگر وہ آیا کا یہ معاشقہ پہلے کبھی دیکھ لیتی تو حقارت سے تھوک دیتی
لیکن اس وقت اس کے جسم کا رُواں رُواں واضح طور پر محبت طلب کر رہا تھا۔
ایک شدید سی لیکن نہایت درجے سستی سی ہُمک۔ آنسو بہنا آپ ہی آپ بند
ہو گئے اور بھیگے ہوئے رخسار گرم ہوا سے خشک ہو کر ایک نمکین سے تناؤ اہٹ
محسوس کرنے لگے۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے شوہر کی طرف ایک بار پھر محبت اور صلح کا ہاتھ بڑھائے گی۔ وہ آج اپنا دل کھول کر رکھ دے گی، تاکہ وہ زندگی کو جینے کے لئے سمجھ سکے۔ ورنہ وہ مر جائے گی، وہ سب پہلی باتیں یاد دلا کر کہے گی کہ ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کئے بغیر کیسے جیا جا سکتا ہے میرے محبوب ؟

وہ اس شدید تحریک سے مغلوب ہو کر کمرے میں داخل ہوئی اب ریڈیو پر ساز کا ایک ریکارڈ غمگین سی طرز بجا رہا تھا۔ اور اس کا شوہر اسی بیہودہ انداز سے بیٹھا ایک فضول سی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں، جیسے اس کا وجود اس کے شوہر کے لئے کوئی حقیقت ہی نہ رکھتا ہو۔ اس کے چہرے پر تنفر آمیز اطمینان ٹھہرا ہوا تھا۔

اس کی مٹھیاں ایک دم بھنچ گئیں اور سارا جسم جل اٹھا۔ صلح اور محبت کا اٹھا ہوا ہاتھ مفلوج ہو کر گر پڑا اور شوہر کے سینے سے لگ کر رونے کی خواہش گھٹ کے رہ گئی۔ وہ تلملائی ہوئی دوسرے کمرے میں نکل گئی۔

اس کا رواں رواں اپنے شوہر کو ایک ایسی بات کہہ رہا تھا کہ اگر وہ سن پاتا تو مارنے مرنے کو تیار ہو جاتا۔ اسے عورت کی ضرورت ہی نہ تھی در اصل وہ پورے جوش کے ساتھ سوچ رہی تھی وہ اس وقت اپنے شوہر کو اس کی بے نیازیوں کی سزا دینا چاہتی تھی، وہ اس سے دغا کرنا چاہتی تھی، پوری نفرت اور شدید بیزاری کے ساتھ وہ کوئی سخت حملہ کرنا چاہتی تھی ـــــ ذرا دیر

تک وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔

" آیا!" اس نے کرخت آواز میں پکارا تو باورچی خانے کے دروازے سے چکنے رخساروں والی گھاٹن جھانکی ۔ اس کی پیشانی پر گدا ہوا ہلال اور تارا سانولے رنگ پر چمک رہا تھا۔

" کیا بولتا بائی ؟" کسی قدر میلے دانت موٹے موٹے ہونٹوں سے جھانکے۔

" اِدھر آ۔" اس کے لہجے کی تندی بڑھتی ہی گئی ——— آیا نارنجی رنگ کی لانگ کی دھوتی میں بھی اپنے جسم کی عریانی کو نمایاں کئے اندر آگئی۔

" کیا رڑتا (روتا) تھا بائی ؟" وہ کھیسیں نکال کر پوچھنے لگی۔

" بک بک نہ کر۔ الماری سے میرا پرس نکال لا اور ———

اور وہ آیا کو بچہ سنبھالے رکھنے کی ہدایت کرتے کرتے رہ گئی۔

" کیا باپو کے گھر جاتا بائی ؟" آیا نے پرس دیتے ہوئے سوال کیا، لیکن وہ بغیر جواب دیئے اپنے رخسار ساری کے پلّو سے صاف کرتی باہر نکل گئی۔ اس کے اندر ایک طوفان اُٹھ اُٹھ کر پھیل رہا تھا۔

پندرہ ہی منٹ بعد وہ اپنی بلڈنگ کے پہلے زینے پر قدم رکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ پورے غصّے اور جھلّاہٹ کے ساتھ ——— " بدمعاش! کمینہ! آج سے چار سال پہلے [illegible] کیسے کیسے اشارے کرتا تھا۔ انگوٹھا(؟)

گروی رکھا تھا اور آج [illegible] نکل گیا"

گویا میں اسس کی اماں تھی - بڑا شریف کا بچہ بن گیا - بد معاش کہیں کا ، مجھے پوچھنے کے بجائے میرے شوہر اور میرے بچے کا مزاج پوچھتا ہے - کتا ــــ "

تیسری منزل کی چالی میں قدم رکھتے ہی اس نے اپنے بچے کے رونے کی آواز سنی ، اور جیسے اس کا دماغ غصے کی شدت سے پھٹنے لگا -

اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ اپنے سامنے کی ہر چیز سے ٹکرا جائے ہر شئے کو توڑ ڈالے - وہ اپنے فلیٹ کے دروازے پر ایک لمحے کو رکی اور پھر پوری قوت سے بند کواڑ کو ہلا ڈالا - اندر سے ڈھیلی چٹخنی کے گرنے کی آواز آئی اور وہ اپنے زور میں کمرے کے اندر گھٹنوں کے بل جا گری -

پھر جب اس نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ آیا اس کے پلنگ سے اپنی تو گز کی ساری سنبھالتی ہوئی اٹھ رہی تھی اور اس کا شوہر پلنگ سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہوا تھا - گھبرایا اور حیران سا ــــ اسے ایسا محسوس ہوا ، کہ وہ ایک بار پھر بڑے زور سے گر پڑی ہے ، ایسی کہ اب اس کا جوڑ جوڑ ٹوٹ گیا ہے -

"کہاں گئی تھی تو ؟" اس کا شوہر اپنی فطرت کی نمائش سے جھلا کر چیخا -

"تو مجھے اپنے جیسا کمینہ سمجھتا ہے۔ اپنے جیسا" وہ اسی طرح زمین پر گھٹنے اور ہتھیلیاں ٹیکے ٹیکے چلائی "ذلیل، کتے، کمینے ——— میں ایسی نہیں ہوں۔ میں ایسی نہیں ہوں ——— نہیں ——— نہیں ——— !"

اور روتے روتے اس کا دم گھٹنے لگا۔ پیٹ سے کوئی چیز اٹھ کر حلق میں اٹک گئی اور چند منٹ بعد وہ بے ہوش ہو گئی۔

کاروبار

انجن نے ایک طویل، سریلی چیخ ماری تو خان کی گدبدی مخمل کی گٹھڑی جیسی بیوی کے جسم میں مضطربانہ جنبش پیدا ہوگئی۔

"خدا حافظ! خدا حافظ میری جان!" اس نے کھڑکی سے گردن نکال کر چپکے سے کہا اور اس کے چھوٹے چھوٹے سفید گالوں پر جیسے گلابی رنگ کی پچکاری چھوٹ گئی ——— خان ... چونک پڑا لیکن اس سے پہلے کہ وہ بیوی سے کچھ کہتا۔ ریل کسی تیز دم گھوڑے کی طرح چند قدم پیچھے چلنے کے بعد گڑگڑاتی شور مچاتی، پلیٹ فارم سے نکل گئی ——— اور خان کی رگوں میں خون کی تیز گردش کے ساتھ نئی نویلی بیوی کی محبت اودھم مچاتی رہ گئی ——— اس کی مشتاق نظریں جو تیزی سے دوڑتی ہوئی ریل پر جمی ... تھیں، ذرا ہی

دیر میں بجلی کے کھمبوں اور لہراتی ہوئی پٹڑیوں کے اوپر تنے ہوئے بجلی کے تاروں میں الجھ کر رہ گئیں ــــــ کانوں میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی اور اس سنسناہٹ سے دور کہیں اس کی بیوی جیسے آہستہ پکار رہی تھی "خدا حافظ! خدا حافظ میری جان!" اس سسکتے سے جملے کی گونج جیسے دھیرے دھیرے اس کے لمبے تڑنگے جسم سے جان نچوڑے لے رہی ہو اور آنکھوں کے سامنے تو بس ڈھیروں گلال اڑ رہا تھا۔ . . . . اس کا جی چاہا کہ وہ پلیٹ فارم سے کود کر پٹڑیوں پٹڑیوں بھاگتا چلا جائے اور جہاں کہیں بھی وہ اس ریل کو پکڑ سکے پکڑ لے، تاکہ اس کی بیوی میکے نہ پہنچ سکے ورنہ اس کے اماں، ابا اپنی نئی بیاہی ہوئی بیٹی کو ایسے کلیجے سے لگا لیں گے کہ تین چار مہینے تک تو وہ واپس آنے سے رہی۔ جیسے ہی اماں ابا کی محبت بیٹے بیٹیوں کو بیاہنے کے بعد زوروں پر ہوتی ہے . . . . مگر ریل تو اس کے احمقانہ ارادوں سمیت اسے بہت پیچھے چھوڑ گئی تھی، اور اب وہ مارے اضطراب کے اپنی چٹکیاں مسل رہا تھا ــــــ

"کون ہے؟" ایک لمبی تڑنگی پارسن نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اپنے ٹھنگنے بھدّے ساتھی سے پوچھا . . . . . . خان چونک پڑا گویا پارسن نے اسی سے تو سوال کیا ہو۔ اس کے جی میں آئی کہ پارسن کو پکڑ کر سمجھے کہ ہے کیا؟ بس فرقت ہی فرقت ــــــ لیکن پارسن اپنی

کالی سلک کی ساری کا پلّو آگے آگے اُڑاتی، سیاہ سینڈل کی ایڑیاں بجاتی کافی دور نکل چکی تھی۔

"کس قدر بے جوڑ جوڑا ہے" اس نے کھسیا کر سوچا اور پینٹ کی جیب سے سگریٹ کیس نکال کر سگریٹ سلگانے لگا۔ کیونکہ وہ یہ ہرگز نہیں سوچنا چاہتا تھا کہ وہ بھی تو اپنی بیوی کے ساتھ کھڑا ہو کر کتنا مضحکہ خیز دکھائی دیتا ہے۔ اس کی بیوی چھوٹے سے قد کی گول مول عورت، کچھ گلابی سی رنگت چھوٹے چھوٹے گلوں کے بیچ میں چھوٹی سی ناک، جس پر بے انتہا شرم کی سرخی ہر وقت لرزتی رہتی بس بالکل سیلولائیڈ کا گپ چپ بوا۔ فرق صرف اتنا کہ بوا کو چھوؤ تو انگلیاں کچھ بیزار سی ہو کر لوٹ آئیں اور اُسے چھوؤ تو انگلیاں آپ ہی آپ دھنسی چلی جائیں بالکل ملائم جیسے نئی روئی کا ریشمی کُشن ——— اور ایک وہ تھا ——— چھ فٹ اونچا، دُبلا پتلا سا۔ جب چلتا تو لگتا جیسے تاڑ کا درخت زمین سے اپنی جڑیں چھڑا کر جگہ بدلنے کی کوشش کر رہا ہے ——— ہونٹوں پر مڑی ہوئی اونچی ناک ——— ایسی اونچی جیسے اس کے چہرے کو دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کرنے کے لئے باقاعدہ دیوار کھڑی کر دی گئی ہو ——— اور وہ پتلی پتلی مونچھیں ——— اتنی پتلی گویا کسی بہت ہی فیشن کی ماری چھوکری کی ننھی کھچی بھویں ——— اس کا بے تکلف دوست میرزا ان دونوں میاں بیوی کو اکٹھا دیکھ کر اکثر ایک کہانی سنایا کرتا تھا . . . . .

"ایک تھا اونٹ ——— ارے بھئی! وہی اونٹ جس کی کوئی کل سیدھی نہیں
ہوتی۔ ایک دن وہ گیا ایک دریا کنارے پانی سڑپنے۔ وہاں رہتا تھا ایک کچھوا
——— اوہ معاف کرنا میرا مطلب ہے کچھوی۔ بس جناب!" میرزا کی کہانی
یہیں سے خان کے ایک زوردار گھونسے تلے دب کر دم توڑ دیتی۔ . . . .
اس پر خان کی بیوی کی ننھی سی ناک پر شرم کی سرخی اتنی گہری ہو جاتی جتنی
برسات کی شفق . . . . یہ دیکھ کر میرزا کی آنکھوں میں للچاہٹ
جھلک نکلنے لگتی اور خان کو اپنی بیوی پر تاؤ آنے لگتا، کہ آخر وہ اتنی شرمیلی
کیوں ہے؟ خواہ مخواہ ہی تو لوگ للچانے لگتے ہیں . . . . . .
اور تو اور جب وہ اس کے ساتھ کہیں گھومنے پھرنے جاتی تو بھی یہی حال رہتا
جھپکتی ہوئی پلکیں جھینپی ہوئی مسکراہٹ سے کپکپاتے ہوئے ہونٹ
اور تازہ مرچ کی سی ناک . . . . جسم ایسا چرا چرا کر چلتی جیسے ساری دنیا
بس اسی کے جسم کے حصے بخرے کرنے پر تلی بیٹھی ہو، اور اس کی اس ادا پر
بمبئی جیسے شہر کے کاروباری قسم کے سڑک چلنے والے پیچھے مڑ مڑ کر اسے
دیکھنے لگتے، جس پر خان بے چارہ کٹ کٹ کر رہ جاتا۔ اس کا جی چاہتا، کہ
فوراً ہی اس گلابی مخمل کے ڈھیر کو کندھے پر اٹھا کر گھر میں پھینک آئے اور پھر
کبھی باہر کی ہوا نہ لگنے دے . . . . . . بالکل اس طرح جیسے کہ اس
کی دادی، نانی، اور ماں وغیرہ بند رہی تھیں . . . . . . لیکن وہ نہیں

چاہتا تھا کہ ایک کمرے میں بند پڑے پڑے وہ مخمل کی گٹھڑی گھدڑ کے جھولے میں
تبدیل ہو جائے ...... دوسرے اس کے جان پہچان والے مہذب لوگ
اسے اکھڑ پٹھان سمجھیں ...... بس! وہ میاں کی جوتیاں کھانے والی بیوی
کی طرح صبر و قناعت کر لیتا .... گھر پہنچ کر وہ اسے سمجھاتا: "دیکھو جان!
شرماتے نہیں۔ ہاں ....." اور وہ یہ سنتے ہی گھٹنوں ہاتھ ٹیک
کر ہونٹوں کی کپکپاہٹ کچھ تیز کر دیتی۔ پلکیں جلدی جلدی جھپکانے لگتی۔ یا پھر
اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے لال گلال چہرہ ڈھانپ لیتی۔ گویا وہ خان کو چڑانے
پر تلی ہوئی ہو ...... آخر ایک دن اس نے بہت جبر کر کے اسے کچھ دن
کے لئے میکے بھیج دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے وہ اس سے جدا
ہو کر اپنے آپ کو چھونے اور دیکھنے کی چیز سے زیادہ سمجھنے اور سمجھانے کی چیز بنا
سکے ... لیکن چلتے چلاتے یہ کمبخت گپ چپ میں کچھ کہہ نہ گئی، ایسا کہہ
گیا کہ اب خان کو اپنی حماقت کا احساس ہو رہا تھا۔ تین مہینے اکٹھا رہنے کے
بعد بھی وہ اسے صرف کشش سمجھ سکا تھا۔ بیوی نہیں .... کتنا الو پن
سرزد ہو گیا تھا اس سے! ——

اس نے سگریٹ کے کئی لمبے لمبے کش لئے اور ڈھیلے ڈھیلے قدم
ڈالتا، اسٹیشن سے اس طرح نکل آیا جیسے اس کی بھری جیب
کتر لی گئی ہو۔

چوڑی صاف ستھری سڑک پر ٹرامیں کھڑکھڑا رہی تھیں، اور بسیں
پہاڑوں کی طرح دندناتی اِدھر سے اُدھر جھپٹ رہی تھیں۔ موٹروں کے ہارن
چیخ رہے تھے اور کہیں کہیں کوئی وکٹوریہ گاڑی سہمی سہمی، دبکی دبکی سی اس
طرح رینگ رہی تھی جیسے امیروں کی ٹھاٹ دار دعوت میں ان کا کوئی پھٹیچر
رشتہ دار . . . . . فٹ پاتھ پر اور اس سے تھوڑا اتر کر، ہر رنگ
اور ہر نسل کے مرد اور عورت قسم قسم کی بولیاں بولتے آجا رہے تھے جیسے
ہر طرف میلہ لگ رہا ہو . . . . آسمان پر گھرے بھورے بادل بڑبڑا
رہے تھے، جن کے سائے میں بمبئی کی سرزمین . . . . اونچی اونچی
بلڈنگوں کو اپنی چھاتی پر سہارے خوبصورت لیکن پکی خود غرض نظر
آرہی تھی۔ جیسے وہ ایک پیشہ ور محبوبہ ہو . . . . . بس! اور اس
پیشہ ور محبوبہ کے ناز و ادا سے بے نیاز خان آگے بڑھتا جا رہا تھا، سگریٹ
کو انگلیوں میں دبا دبا کر، ہونٹوں میں بھینچ بھینچ کر ——— اپنی
بلڈنگ تک پہنچتے پہنچتے اس نے کئی سگریٹیں راکھ کر دیں۔ مگر اس کے
دل میں بشاشت کی ایک چنگاری بھی نہ چمکی ———

پہلے زینے پر قدم رکھتے ہوئے اس کی مڈبھیڑ مسز ہیرِک سے
ہوئی جو گہری نیلی فراک میں کسی تنی ہوئی، بھورے بھورے بالوں کو تاج کی طرح
سجائے، تیزی سے زینہ اتر رہی تھی۔ وہ اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

"اوہ! مسٹر کھان ـــــ" مسز پیٹرک نے اس کی بد دلی اور بے نیازی نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ اس کے سفید سفید دانت مارے خوش اخلاقی کے چمچما اٹھے: "اپنا دالفت کو اسٹیشن چھوڑ کر آیا؟" وہ ذرا جھک کر بولی۔ . . . لیکن خان یوں ہی دانت نکالے رہا۔ اسے اس وقت یہ بھی برا نہ لگا کہ مسز پیٹرک اس سے بجائے انگریزی میں بات کرنے کے گویا شاہی اردو میں بولتی ہے، آخر وہ اس کی تہذیب اور تعلیم کو کیوں پس پشت ڈالدیتی ہے۔

"ایوننگ میں چائے ہمارے ہاں لینا مانگتا ہے ـــــــ ایں؟" وہ اسے مدعو کر کے اس تیزی سے سڑک پر نکل گئی جیسے اسے سنگوارے چیزوں کی دوکان پر لوٹ میں شرکت کرنا ہو۔ کیونکہ اس وقت اس کے ہر گھڑی انگاروں کی طرح دہکنے والے ہونٹ بکی جامنوں سے اپنا رشتہ ظاہر کر رہے تھے ـــــ

خان نے اپنی انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ کا ٹکڑا جھٹک دیا اور اپنی کاہی رنگ کی فیلٹ گدی پر جھکا کر پیشانی کی نمی رومال سے صاف کرتے ہوئے زینہ چڑھنے لگا ـــــ مضمحل اور اداس ـــــ اسے مسز پیٹرک کی بچھائی ہوئی مسکراہٹ نے ذرا بھی خوش نہ کیا تھا۔ حالانکہ شادی سے قبل دفتر کی ساری تکان وہ اس کی ایک ایسی چھوٹی سی مسکراہٹ کے سہارے اتار پھینکا

کرتا تھا۔ اب بھی بیوی کو میکے بھیجنے کا فیصلہ کرنے کے بعد اس نے مسز پیٹرک ہی کا سہارا لینے کا ارادہ کیا تھا۔ . . . . مگر بیوی کو جس حالت میں اس نے رخصت کیا اس کے بعد وہ خود کو ایک سخت وفادار اور معصوم قسم کا شوہر محسوس کرنا چاہتا تھا۔ . . . "چھی! کتنی بے شرم عورت ہے" خان نے تیسری منزل کی چالی میں قدم رکھنے سے پہلے، ہانپتے ہوئے مسز پیٹرک کے متعلق خیال قائم کیا اور ساتھ ہی اسے اپنی بیوی کی بے جا شرم و حیا بالکل بجا معلوم ہونے لگی۔

اپنے کمرے کا قفل کھول کر خان نے اس طرح اندر جھانکا جیسے اپنی قبر میں جھانک رہا ہو ——— پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر اندر چلا گیا گھر سُونا سونا ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی حسرت سے اِدھر اُدھر دیکھا اور اور پھر کر بالکل مایوس ہو کر اپنے تار جیسے جسم کو تہ کر کے آرام کرسی پر گرا دیا مگر جلد ہی اسے شاید یہ بات سوجھی کہ غم کرنے کا یہ انداز عورتوں کو زیادہ جچتا ہے۔ نڈھال جیسے جوڑ جوڑ ٹوٹ گیا ہو، گردن ڈھلکائے عورت زیادہ پیاری لگ سکتی ہے۔ وہ فوراً ہی اٹھا اور آرام کرسی پر بڑی بے آرامی سے بیٹھ گیا۔ گھٹنے پر دائیں ہاتھ کی کہنی جما کر اور اپنی لمبی سی ٹھوڑی کو مٹھی میں پکڑ کر . . . گویا بچہ آم نچوڑ رہا ہو، گوالا بکری دوہ رہا ہو . . . . وہ اپنے آپ کو غم و فکر کا مجسمہ تصور کر رہا تھا۔ اور اس کا جی چاہ رہا تھا۔ کہ کاش

اس وقت وہ اپنی بیوی کی پشیم تصور میں ہو۔۔۔ کاش۔۔۔۔۔
کاش! اور پھر گویا وہ وہاں نہیں رہا، جہاں بیٹھا تھا۔ گرم سوٹ کے نیچے پسینے کے قطرے ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑتے رہے، مگر وہ ہلا تک نہیں۔ اسے اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ اٹھ کر کپڑے تبدیل کر لے یا بالکونی کا دروازہ اور کھڑکی ہی کھول لے ۔ اُوہ! کس قدر تکلیف دہ ہوتی ہے۔ نئی نویلی بیوی کی جدائی اور پھر وہ بھی ایسی بیوی جو چلتے پھلتے شدید قسم کی محبت کا اظہار بالکل غیر متوقع طور پر کر جاتے۔ ارے توبہ!

"ٹک ـــــ ٹک ـــــ" میرزا نے کمرے میں جھانک لینے کے بعد کھلے کواڑ پہ انگلی بجائی۔ خان چونک پڑا۔ اسے شاید یہ بالکل ہی یاد نہ رہا تھا کہ کل دفتر ہی میں میرزا کے ساتھ سیر و تفریح کا ایک گرما گرم پروگرام بنایا تھا۔ اور میرزا اسی لئے ٹھیک وقت پر بسم اللہ کہنے پہنچ گیا تھا۔

"میں نے کہا خانِ اعظم! اندر آسکتا ہوں؟" میرزا خان کے لمبے تڑنگے جسم کی رعایت سے اسے خانِ اعظم کہا کرتا تھا۔ خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس بالکل تازہ ترین یتیم کی طرح ٹکر ٹکر اس کو تکنے لگا۔۔۔۔۔
میرزا تکلف کو برطرف کر کے خود ہی اندر آگیا اور دوسری آرام کرسی سنبھال لی۔

" بھابی کو سوار کرا آئے نا اس کے اُبا کی چھاتی کے لئے" میرزا نے

دوبارہ سکوت توڑا۔

"ہوں!" خان نے جیسے آخری سانس کے ساتھ ہوں کی۔

"تو پھر یار میں نے کہا تم بھی ساتھ چلے گئے ہوتے۔ یہاں بیٹھ کر روتی صورت بنانے سے فائدہ؟" میرزا نے طنز سے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں بے! یہ بات نہیں۔" خان کچھ شرمندہ ہوگیا۔

"تو میرے لال، یہ بات نہیں تو وہ بات ہوگی۔" میرزا نے ذرا جوش میں آکر بیٹھتے ہوئے، پھر شانے اچکا کر دوبارہ اپنے سینک سلائی جسم کو جلدی سے آرام کرسی پر گرادیا کیونکہ اس نے دیکھا کہ خان ہنسنے کے ساتھ ساتھ گھونسہ مارنے کے لئے مٹھی بھی کس رہا تھا۔ اور میرزا کا دم نکلتا تھا خان کے گھونسوں سے . . . . . . جانے کیا عادت تھی خان کو گھونسہ بازی کی۔ اگر اسے کوئی ایسا بے تکلف دوست نہ ملتا جو اس کے گھونسوں کی داد دے سکے تو وہ دیوار تک پہ نوازش کرنے سے چوکتا . . . . فضول ہی تو۔

"بس خان اعظم!" میرزا نے ذرا پیار سے دید سے نکال کر کہا۔ "میں نے کہا جانے کیا عادت ہے تمہاری

...... لاحول ولا ...... ہینھ!"

اس نے سر کو جھٹکا اور پھر مسمسی بلّی کی طرح آنکھیں بند کر کے کرسی کے ہتھے پر کسی گت کی درگت بنانے لگا۔

خان کے کرخت چہرے پر شگفتگی آگئی۔ اور آنکھوں میں چمک .... وہ اترا کر بولا۔"ہاں یار جانے کیا بات ہے کہ جہاں کوئی سخت چیز سامنے آئی وہاں میری مٹھیاں بند ہو ہیں۔ جی چاہتا ہے چورا کر کے پھینک دوں ...... خصوصاً تیری ہڈیاں"

خان نے میرزا کی طرف گھونسہ بڑھاتے ہوئے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبالیا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت پیدا ہوگئی۔ گھونسہ دھڑ سے میرزا کی ران پر پڑا اور وہ اچھل پڑا۔

"میں نے کہا ..... جی میں نے کہا ....." میرزا نے اپنی ران پر کرر کٹ لگا دی۔ بالکل اس گھوڑے کی طرح جس کو چلانے کے لئے چابک برسائے جائیں۔ اور وہ ہڑبڑا کر بجائے آگے بڑھنے کے دائیں بائیں ہی چکر کھا کے رہ جائے۔

اب خان زور زور سے ہنس رہا تھا۔ بڑی دیر کے بعد غریب میرزا
"میں نے کہا" کے چکّر سے نکل سکا۔

" سخت چیزیں دیکھ کر گھونسے مارنے کو جی چاہتا ہے۔ اور نرم
دیکھ کر؟" میرزا کی آنکھوں میں جستجو کی ایک بے چین سی جھلک تھی ۔۔۔
خان کی ہنسی پھیکی پڑ گئی ۔۔۔۔۔۔ اور اس پر بیوی کی یاد کا دورا پڑ گیا
۔۔۔۔۔ گدگدی چیز کا نام جو آ گیا۔

" دھت ۔۔۔۔۔۔" اس نے شرما کر میرزا کو دیکھا اور پھر اس کی
نظریں بچا کر وہ بڑی للچاہٹ سے مسہری کی طرف دیکھنے لگا جو کمرے کی
کافی جگہ گھیرے ہوئے تھی۔ اور جس پر اس کی بیوی دن کا زیادہ حصہ بیٹھے
بیٹھے یا پڑے پڑے گزار دیا کرتی تھی چلتے پھرتے میں اس سے اپنا چھوٹا
موٹا جسم ٹھیک طرح سے نہ سنبھلتا۔ اس لئے وہ عموماً مسہری پر ڈھیر
رہا کرتی ۔۔۔ گلابی مخمل کی گٹھڑی جو ذرا چھونے سے سرخ پڑ جاتی۔ خان
چاہے مارے چٹکیوں کے اس کا گوشت اڑا لے مگر وہ تھی کہ ایک چپ
۔۔۔ پھولے پھولے پپوٹے آنکھوں پر گرے ہوئے اور کپکپاتے
ہوئے ہونٹ ۔۔۔۔۔۔ جانے وہ ہنسی ضبط کرتی یا آنسو۔ کچھ پتہ نہ چلتا۔
خان کو اس کی اتنی خاموشی سے سخت اکتاہٹ ہوتی۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ وہ
بے تکلفی سے ہنسے بولے، اس کی شرارتوں پر روٹھے، جواب دے ۔۔۔

کچھ تو اچھا برا کہے . . . . . یہ کیا کہ کشن کی طرح پڑی ہے . . . . .
وہ اپنے خاندان کے گنتی گئے گریجو یٹوں میں سے تھا - اور دوستوں کے
حلقے میں بیٹھ کر بیوی کو نصف بہتر کہنے کا عادی . . . . . بیوی کی زبان
سے اپنے متعلق کچھ نہ کچھ سننے کا مشتاق . . . . مگر اس کی بیوی تھی
کہ ہر حرکت کے جواب میں سرخ پڑجانے کے سوا کچھ جانتی ہی نہ تھی
. . . . . اس کی اس ادا سے وہ اور بھی جھنجھلا کر ضدی بچوں کی طرح
اسے نوچنے لگتا . . . . . اس صورت میں اسے یہ احساس ہی نہ
رہتا کہ وہ اس کی نصف بہتر ہے - بلکہ وہ اس کا پھوہڑ کرایہ دار کا سا بن جاتا
جو مکان کا کرایہ ادا کرکے اس کی دیواریں ڈھانے میں کوشاں ہو جائے
. . . . . مگر خیر یہ تو کئی گھنٹے پہلے کی کیفیات تھیں - اب تو اسے
یقین تھا کہ اس کی بیوی ہرگز اس کی حرکتوں کو ناپسند نہیں کرتی ورنہ کیا
وجہ تھی کہ وہ چلتے چلاتے اپنی شرم و حیا بالائے طاق رکھ کر یوں کھلم کھلا
اظہارِ عشق کر گئی - خان نے جی میں سوچا کہ یہ عورتیں بھی بڑی بشر یر ہوتی
ہیں . . . . . اگر ٹرین میں بیٹھنے سے قبل ہی ایسے پیار سے کچھ کہدیا
ہوتا تو آخر اسے جانے ہی کیوں دیتا ؟

"چلو اُٹھو، گھومنے نہیں چلو گے یار ؟ میں نے کہا کس سوچ میں
ہو ؟" میرزا نے اکتا کر تقاضہ شروع کیا -

"نہیں بھئی، اس وقت جی نہیں چاہتا کہیں آنے جانے کو۔" خان اٹھا
اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ اس نے فیلٹ اور کوٹ اتار کر مسہری پر پھینک دیا
اور ایک گلاس پانی پی کر لہراتا ہوا بالکونی کا دروازہ اور کھڑکی کھولنے
گیا۔ اور پھر واپس آکر اس طرح کرسی پر پڑ گیا۔

"نہ جاؤ۔ . . . . بس نخرے کئے جاؤ۔ ہونہہ!" میرزا بڑبڑایا اور
اس نے بالکونی کے دروازے کے پردے کو ایک طرف جھٹک دیا۔ جو
ٹھنڈی بھیگی ہوا کے متواتر جھونکوں سے اس کے منہ پر سرسرا رہا تھا۔ . . . .
. . . . اسے واقعی سخت غصہ آرہا تھا۔ یا تو خان نے بیوی کو بھیجنے کر،
کئی روز قبل سے اس کے کان کھانا شروع کر دیئے تھے کہ یہ کریں گے؛
وہ کریں گے۔ اور اس طرح اپنی زندگی کے چھڑے چھیلے دنوں کی یاد تازہ
کریں گے . . . . یا اب دم نکلنے لگا احمق کا!

"برا نہ مان یار، سچ مان اس وقت باہر جانے کو جی نہیں چاہتا . . . .
دیکھ تیری بھابی چلی گئی ہے نا تو کچھ بُرا سا لگ رہا ہے۔" خان نے ذرا
شرماتے ہوئے دردِ دل کہہ دیا۔ مگر میرزا نخرہ بائی دلہنوں
کی طرح روٹھا ہی رہا۔

"اچھا اٹھ! میز پر سے تاش اٹھا لا . . . . بس آج یہی کھیل رہیگا۔"
خان گھگھیا کر بولا۔ کرتا کیا غریب، وہ تو لاکھ چاہتا کہ ذرا خوش ہو مگر کمبخت دل!

میرزا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید اس پر بھی خان کی بیبیزاری غیر شعوری طریقے پر اثر انداز ہو رہی تھی . . . . اسے چپ دیکھ کر خان خود ہی اٹھا اور تاش اٹھا لایا۔ پھٹا پھٹ تاش پھینٹتے ہوئے وہ مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا جیسے اسے احباب کی دلداری کرنے کا احساس گدگدا رہا ہو . . . . . . میرزا تاش دیکھ کر اپنی بیبیزاری کو روک نہ سکا۔

"فلاش ہو گی پھر؟" اس نے گرما کر تجویز پیش کی۔

"ہاں . . . . . ہاں" خان نے پتے بانٹنے سے پہلے پینٹ کی جیب ٹٹولی تو میرزا نے بھی تقلید کی۔

پتے بانٹے گئے . . . . . . پیسوں پر پیسے پڑنے لگے۔

"کھلواتے ہو؟"

"نہیں!"

پھر روپوں پر روپے پڑنے لگے . . . . آخر میرزا نے پتے کھلوا لئے۔ وہ سمجھتا تھا کہ خان ہیکڑی میں روپے لگاتا چلا جا رہا ہے، پتے ہی نہیں کام کے . . . . مگر جب اس کے پتے دیکھے تو میرزا کا منہ لٹک گیا اور مٹھی بھر روپے خان کے پاس پہنچ گئے . . . . .

دوسری بازی شروع ہوئی . . . . . پھر تیسری . . . .

کئی۔ بیتا رہا۔ وہ دونوں بہت خاموشی سے کھیل رہے تھے۔ میرزا جی ہی جی میں کھلا جا رہا تھا۔ کچلو خان کے روپے سے تفریح نہ سہی نقد انقد کیا برے ہیں؟ سارے۔۔ سارے روپے جیت لے گا وہ چٹکی بجاتے ہیں۔۔۔۔ ۔۔۔۔ پہلی دفعہ حضرت جیت گئے تو کیا؟ نرے احمق تو ہیں اونٹ ساحب۔۔۔۔۔ آخر ہیں تو خالی خولی خان صاحب، چاہے بنیں لاکھ ——— مگر توبہ!

وہ ڈھلتی عمر کی مسز پیرا بازو کے کمرے میں بار بار اپنی چھوٹی بچی کو پکارنے کے لئے کوہنے لگی ————

"بٹی۔۔ بٹی ڈارلنگ!"۔۔۔۔۔ اور بیچ بیچ میں پکارنا ملتوی کر کے ایک انگریزی گانا گانے لگتی کیسی ریکارڈ کی بالکل بے ڈھنگی سی نقل، جیسے اس کے گلے میں سخت تکلیف ہو رہی ہو۔۔۔۔۔ لیکن اس کے اس کربناک انداز پر میرزا کا دھیان بار بار کھیل کی طرف سے بھٹکنے لگا۔۔۔۔۔

بات یہ تھی کہ وہ جب بھی خان کے یہاں آتا تو بٹی کو۔۔۔۔ پیاری سی چینی کی گڑیا جیسی بٹی کو عموماً چالی میں کھیلتے ہوئے پاتا۔ اور مسز پیرا کو اس کے پیچھے کوستے ہوئے۔۔۔۔۔ اسے جانے کس طرح بٹی پیاری سی لگنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ اسے میری منی بیٹی کہنے لگا۔ بسکٹوں کے ڈبوں سے لے کر ۔۔۔ چاکلیٹ سے ۔۔۔۔۔۔ لگ

لگا۔ اور مسز پریرا کی کوک میں کرارا پن آتا گیا۔ میرزا کو جب بچی بہت پیاری ہو گئی تو اس کی ماں سے پیار نہ ہونا ناممکن تھا۔ لیکن مسٹر پریرا کو مسز پریرا سوتی زانو میں ہی بھلی لگتی تھی۔ اسی لئے میرزا انہیں نظر انداز ہی کر گیا۔ مگر کمبخت ذہن کے تو پر لگے ہوتے ہیں ایسے معاملات میں۔

میرزا کھیل میں پورا دھیان نہ دے سکا . . . . . خان نے تیسری مرتبہ جیتے ہوئے روپے سمیٹے اور بڑی بدمزگی سے پتے گڈی میں رکھ دیئے۔

"بس بھئی اب جی اکتا گیا" وہ آرام کرسی پر دراز ہونے لگا۔

"ہیلو! ابھی سے؟ واہ اور کھیلو میں نے کہا" میرزا کھسیا گیا۔ وہ سب روپے ہار چکا تھا نا۔

"نہیں بھئی! روپوں کے لئے دم نکل رہا ہو تو لے لو یار اپنے" خان نے مخصوص بے نیازی سے کہا۔ اس پر پہلی ہی بیزاری چھائی ہوئی تھی۔ میرزا کا کلیجہ نوچ کر بھی اس کے جسم میں چستی نہ آئی تھی۔

"ارے! یہ بات نہیں ہیلو!" میرزا نے جھینپ کر اپنے گدگدی جھٹکے دیئے . . . . . کمبخت مسز پریرا اب خاموش تھی اسے لٹوا کر۔ میرزا کی رگوں میں دبے دبے غصے کی جھنجھناہٹ دوڑ رہی تھی۔ "لاحول ولا۔ . . . . ." اس کا جی چاہا کہ زور زور سے بکے۔ مجھے جیب دے گی۔

بیوی کو بھیج کر مرا جا رہا ہے اونٹ کہیں کا . . . . . . بمبئی میں عورتوں کا
کوئی سا قحط پڑ گیا ہے ؟ فضول ہی تو سنی ساد تی بن رہا ہے مینھ !

اب دونوں اپنی اپنی کرسیوں پر خاموش پڑے ہوئے تھے . . . . . . میرزا سلگ رہا تھا اپنے گھاٹے پر اور خان پگھل رہا تھا بیوی کے فراق میں ــــــ

چائے پینا چاہیے یار" تھوڑی دیر کے بعد میرزا کو سوجھی، اس خیال سے کہ ممکن ہے اس طرح خان کی بیزاری میں کچھ کمی ہو جائے اور وہ دوبارہ کھیلنے پر آمادہ ہو جائے یا کم از کم اپنے وعدے کے مطابق اسے اپنے ساتھ سیر و تفریح کے چیٹ پٹے پروگرام میں شریک کرے تاکہ اس کا گھاٹا ادھر پورا ہو جائے ۔

"منگواؤ . . . " خان نے اپنی چٹکیاں مسلتے ہوئے کھوئے سے لہجے میں کہا ۔ میرزا تیزی سے بالکونی میں چلا گیا ۔

"باہر والا . . . . . . او باہر والا" میرزا نے بمبئی کے مخصوص انداز میں تالیاں بجا بجا کر اور شش کار کر پکارنا شروع کیا ۔ . . . . .

"دیکھو باہر والا . . . . . . دو کپ چائے لاؤ ادھر کو . . . . . .

بابا ام بولتا دو چائے . . . . . . ہاں . . . . . " سامنے والی بلڈنگ کے نیچے والے ریسٹورنٹ میں آرڈر دینے کے بعد وہ خاموشی سے اپنی

کرسی پر آ پڑا . . . . . . روپے ہار جانے پر اس کا دل اینٹھ رہا تھا۔

کمرے میں ایک بار پھر فکرمندانہ سکوت نے اپنا سایہ کر دیا۔

دروازے کا پردہ ہلا اور اس میں سے زیتونی رنگت کا ایک پھولا پھولا چہرہ جھانکا، گھٹا ہوا سر . . . . . . گول گول آنکھیں، اور کسی قدر موٹے ہونٹ . . . . دونوں کی نظریں بیک وقت اس طرف اٹھ گئیں اور دونوں ہی ہنس پڑے۔ چہرہ غڑاپ سے غائب ہو گیا۔ اور پھر ایک چھوٹا سا ہاتھ کمرے میں داخل ہوا۔ جس نے تلے اوپر دو کپ تھام رکھے تھے۔

"اوہ! باہر والا! . . . . . ." میرزا کے منہ سے نکلا۔

"آجاؤ اندر . . . . ." خان سنبھل کر بیٹھ گیا اور مڑی ہوئی ناک پر ہلکی سی سرخی قدم جمانے کی کوشش کرنے لگی . . . . . .

باہر والا ڈرتے ڈرتے اندر آ گیا۔ چھوٹا سا لڑکا، عمر کوئی آٹھ نو برس کی ہوگی بھاگتے ہوئے ہرن کی طرح گھبرا گھبرا کر دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

"شاید نیا آیا ہے بمبئی میں" میرزا نے چھوکرے کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے غبارے میں کس کے ہوا کھبر دی گئی ہے۔ دیکھ رہے نا میرزا ؟" خان نے اس طرح کہا۔ جیسے ہری مرچ چبالی ہو۔

"تم کدھر سے آیا ہے ممبئی کو ؟" میرزا نے خان کی دلچسپی کو مدِنظر رکھتے ہوئے باہر والے سے سوال کیا۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید وہ اس کی زبان نہیں سمجھ پا یا تھا۔ یا وہ جواب ہی نہ دینا چاہتا تھا۔ بس وہ اپنی قمیص کے کھلے گریبان کو پکڑ کر حیران آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کی باچھیں رال سے بھیگی ہوئی تھیں۔

"تمہارا کیا نام ہے ؟" خان نے اور زیادہ دلچسپی سے پوچھا اب بھی وہ کوئی جواب نہیں دے سکا۔ ہاں ہونٹ کھل گئے۔ اور رال ٹھوڑی پہ بہ گئی۔

"گندہ ہے۔ ایہہ ہی۔" میرزا نے منہ بنا کر جھرجھری لی۔ لیکن خان کی آنکھوں میں چمک کچھ تیز ہو گئی۔

"ہماری بات نہیں سمجھتا، شاید کہیں باہر کا رہنے والا ہے۔" خان نے کپ میز پہ رکھتے ہوئے کہا۔ اور باہر والے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ننھا سا پھولا پھولا ہاتھ مخمل کی طرح نرم اور نئے لحاف کی طرح گرم... اسے اپنی بیوی کے ہاتھ یاد آ گئے۔ جن کے لمس میں انہی کیفیات کا

پاس ہوتا تھا۔ اس نے بے اختیاری میں وہ ننھا سا ہاتھ اپنے کھُردرے

کھُردرے ہاتھ میں بھینچ لیا . . . . . .

"قیں . . . . . ." چھوکرے کے منہ سے آواز نکلی جیسے مرغابی

چیخ کر ڈر گئی ہو . . . . . . اور میرزا پر شدید ہنسی کا دورہ پڑ گیا . .

. . . . باہر والے نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ خان کی آنکھوں

کی چمک دحشت میں تبدیل ہو گئی . . . . . . اس نے باہر

والے کو بے دردی سے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اور اس کے ملائم

ہاتھوں اور گلوں کو اپنی چٹکیوں میں مسلنے لگا . . . .

"قیں . . . . . . قیں . . . ." باہر والا کمزور سی

مدافعت کرتے ہوئے چیخنے لگا۔

"مرغابی . . . . . مرغابی . . . . . ." میرزا مارے ہنسی

کے لوٹ لوٹ کر جیسے کراہنے لگا۔

باہر والے کے زیتونی چہرے کی جلد کے نیچے خان کی چٹکیاں

بیربہوٹیاں جلتی جا رہی تھیں . . . . . . اور وہ بے بسی سے

ٹکر ٹکر خان کا منہ تک رہا تھا . . . . . . آخر خان نے اس کے منہ

پر ایک زوردار چپت لگا کر اسے چھوڑ دیا۔ اور کھل کر میرزا کی ہنسی میں

شریک ہو گیا۔ اب ننھا باہر والا رال کے ساتھ آنسو بھی بہا رہا تھا۔

"بچ بچ . . . . رونے لگا بچہ" خان اس کے آنسو دیکھ کر شرمسار ہوگیا۔ اب کے اس نے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "نہ بیٹا۔ رونا کاہے کو ہے۔ ہم تیرے سے مسخری کرتا تھا . . . . چپ ہوجا" پر ننھا باہر دانا دال اور آنسو بہاتا رہا . . . . خان کو ذرا دکھ نہ ہوا . . . . وہ اکثر گود کے بچوں کو ستا کر بھی بعد میں دکھ محسوس کرتا تھا۔ اور یہاں تو میرزا بھی تھا۔ اب کے اس نے میز پر سے دو دو نیاں اٹھا کر اس کے سامنے کردیں۔ تاکہ وہ بہل جائے . . . . باہر دانا کی سسکیاں ایک دم رک گئیں۔ اس نے دونیاں اپنی مٹھی میں بھینچ لیں اور فوراً ہی موٹے سے بینڈک کی طرح پھدکتا کمرے سے نکل گیا۔

خان کا دل یہ سوچ کر فوراً مطمئن ہوگیا۔ کہ اس نے کس . . . ادا کردیا ہے۔

"تو خانِ اعظم یہ بات بھی ہے؟ کیوں؟" میرزا نے ہنسی سے بچا پاکر لیپ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ اور اپنی چیاں . . . آنکھیں خان کے چہرے پہ جمادیں۔

"کیا بات . . . . اوہ نہیں بے۔ بس ویسے ہی شرارت سوجھی تھی۔ تو مجھے دس سال سے جانتا ہے" خان نے اپنی صفائی

میں اور جلنے کیا کیا کہا، پر میرزا طنز سے ہنستا ہی رہا۔ جوئے میں ہار کر
اس کا جی چاہ رہا تھا۔ کہ خان کو کسی نہ کسی طرح تکلیف پہنچائے۔ ویسے
اگر کوئی خان کے دل میں بیٹھ جاتا تو خان کی صفائی کو لفظاً بلفظ صحیح
پاتا۔ وہ اپنی بیوی کا صدقِ صد وفادار تھا۔ ہاں یہ الگ بات تھی۔ کہ موٹے
پھولے جسم کو دیکھ کر وہ چٹکیاں لینے سے باز نہ رہ سکتا تھا۔ بابردااللہ تو
بابردااللہ وہ ایسے گودی کے بچوں کو بھی ستانے سے نہ چوکتا جو اس
کے قریب آجاتے حد تو یہ تھی کہ وہ ہر صبح اپنے ریسٹورنٹ کے موٹے
بوڑھے ایرانی سے محض اس لئے مصافحہ کرتا کہ اس کا ہاتھ
گدگدا تھا . . . . . ٹرام یا بس میں بیٹھنے کے لئے وہ حتی الامکان
وہی سیٹ منتخب کرتا جس پر کوئی موٹا سا مرد یا عورت بیٹھی ہوتی۔ اور
کسی نہ کسی طرح موٹی سی ران یا روئی جیسی توند اسے مس کرنے میں بڑا
لطف آتا . . . . اگر اسے پٹ جانے کا خوف نہ ہوتا۔ تو
وہ ہر ایسے شخص کو نوچنے سے نہ چوکتا۔ غرض نوچنا کھسوٹی اور مار دھاڑ
کرنے کی خواہش کو وہ کسی طرح نہ روک سکتا تھا اور نہ اس لذت سے
دستکش ہونے کا خیال کر سکتا تھا۔ جو اسے ان حرکتوں سے حاصل ہوتی
تھی اور اب کیا تھا جبکہ اس کی گپ چپ بیوی اپنی شرم و حیا کو توڑ کر
[illegible] سے اظہارِ محبت کر گئی تھی۔ وہ بیوی جب اس نے چکی بازی کا تختہ

مشق بنایا تھا۔

وہ دونوں چائے پیتے رہے۔ ساتھ والے کمرے میں مسز بریرا نے کچھ گنگنا شروع کیا اور میرزا نے بے چین ہونا۔

ذرا دیر بعد باہر والا خالی کپ لینے آیا۔ اب اس کی آنکھوں میں وہ خوف نہ تھا۔ جو پہلی مرتبہ کمرے میں داخل ہوتے وقت تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پان کی سرخی رچی ہوئی تھی۔ اور ایک کلا پھولا ہوا تھا، اس کی تمبض کی جیب میں پیسے جھول رہے تھے۔

خان نے چائے کے دام دینے کے بعد اس کی پیٹھ کو پدرانہ شفقت سے تھپکا۔ باہر والا بولایا ہوا سا کپ لے کر چلا گیا۔

معاً خان نے سوچا کہ اب شاید وہ یہاں چائے لے کر کبھی نہ آئیگا کبھی نہیں ———

اور اس پر ایک بار پھر پوری شدّت سے بیوی کی یاد کا دورہ پڑ گیا۔

لیکن اس کا یہ خیال جلد ہی غلط ہو گیا۔ جبکہ دوسرے دن اس نے دفتر سے آکر بالکونی میں کھڑے ہو کر بمبئی کے مخصوص انداز میں "ایک چائے کا آرڈر دیا۔ اس نے دیکھا کہ غبارے جیسا ننھا باہر والا دوسرے نوجوان باہر والے کی طرف لپکا اور اس کے ہاتھ سے کپ لیا جو اس

کے پاس چائے لا رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چند منٹ بعد ننھا باہر والا
اس کے کمرے میں داخل ہوا ۔ آج اس کی باچھوں میں رال کے ساتھ
خفیف سی مسکراہٹ بھی کپکپا رہی تھی ۔ جیسے وہ خان کے کل والے طرزِ
عمل سے ناراض نہ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس ہمت افزائی سے خان
کی انگلیوں میں چُل ہونے لگی ۔ اس نے اس کے گال پر ایک بگوٹا لے
لیا ۔ باہر والا اپنی مخصوص قیں نہ دبا سکا ۔ اور خان کو ہنسی آگئی لیکن
اس کی ہنسی اس وقت ٹھٹک گئی ۔ جب باہر والے نے آنسوؤں
میں بھری ہوئی گول گول آنکھیں اٹھا کر فوراً ہی اپنا ہاتھ پھیلا دیا ۔ ۔ ۔ ۔
وہ خان سے قیمت طلب کر رہا تھا ۔ خان ایک لمحے کے لئے اس کاروبارِ
صورتِ حال کی وجہ سے بھونچکا رہ گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر اس کے
لمبے تڑنگے جسم کے اوپر رکھی ہوئی کھوپڑی میں محفوظ بھیجا گھور اندھیرے
میں پڑا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے چھوکرے کے ہاتھ پر چونی رکھ دی
اور اسے موٹے مینڈک کی طرح کمرے سے باہر جاتا ہوا
دیکھنے لگا ۔

اب باہر والا ہر روز آنے لگا ۔ اگر خان چائے نہ منگواتا تو بھی وہ
اپنی مرضی سے ایک کپ لے آتا اور پھر اپنے آپ کو خان کی چپتوں اور
چٹکیوں کے سپرد کر کے کچھ پیسے وصول کرے جاتا ۔ اس کی باچھوں

ہیں رال اب بھی کپکپاتی اور آنکھوں سے دبا دبا سا خوف برابر جھانکتا رہتا مگر اب اس کے آنسو نہ آتے - جیسے وہ عادی ہو گیا ہو . . . . خان بھی اب اپنی بیوی کی جدائی سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ پہلے روز ہوا تھا . . . . . ایک ماہ کے عرصے میں اس نے کئی بار مسز پیریرا کے ہاں چائے پی تھی - اور اسے اپنے ساتھ سنیما لے گیا تھا . . . . . . چالی کے آخری سرے پر رہنے والی مراٹھی لڑکی چندر بھاگا کے سانولے سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم کو نظریں گڑا گڑا کر دیکھا تھا - چند سال پہلے چندر بھاگا چھوٹی سی گھگھری اور پولکا پہنے ساری چالی کے کمروں میں بیٹیوں کی طرح جھانکتی پھرتی تھی - اور اب پتہ نہیں کیوں آپ ہی آپ جھکی جھکی شرمائی رہتی تھی . . . میرزا کے ساتھ اس نے مسز پیریرا پر ایسی ایسی تنقیدیں کی تھیں - کہ اگر مسز پیریرا سن پاتی تو پیالی کی لگا کر دم دے دیتی . . . . . وہ کتنی ہی بار میرزا کے ساتھ تفریح کو گیا اور اس طرح میرزا کی دوستی کا ٹیکس بخوشی ادا کیا - اسی دوران میں اس کی بیوی نے اسے کئی خط لکھے . . . . . . بدخطی کے بہترین نمونے لیکن محبت کے سستے سستے جملوں سے سجا ہوا خط . . . . پر اب خان کو اسے بلانے کی اتنی جلدی نہ تھی - وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی جدائی کی تکلیف

سے اتنی بیتاب ہو جائے کہ بے انتہا شرم کی کنچلی اتار پھینکے . . . .
مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ اپنی بیوی سے بے وفائی کرنا چاہتا تھا۔ یا کر چکا تھا۔ وہ صبر سے کام لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ اسے میٹھا پھل ملنے کی اُمید تھی ۔

لیکن اس دن وہ ایک دم بے صبرا ہی تو ہو گیا۔ جبکہ حسب معمول باہر والا چائے لے کر نہ آیا۔ اس کے منہ میں بار بار رھیکا سیٹھا پانی چھلنے لگا . . . . وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا . . . . . . یہاں تک کہ اس کے کمرے میں شام کا اندھیرا رات سے ساز باز کرنے لگا ۔ اور سڑک پر بجلی کی بتیاں جاگ گئیں ——

"باہر والا . . . . . . اے باہر والا ۔ ایک کپ چائے لاؤ۔" اس نے بالآخر بالکونی میں آکر پکار ہی لیا ۔

"اچھا صاحب ۔" ریسٹورنٹ سے جواب ملا ۔ خان چپ چاپ کمرے میں آ گیا ۔ بلب روشن کیا اور بے آرامی سے آرام کرسی پر بیٹھ گیا ۔

ذرا دیر بعد سیاہ رنگ کا ایک باہر والا چائے لئے کمرے میں داخل ہوا اور خان کو جیسے چکر سا آ گیا ۔

"وہ چھوکرا کدھر گیا ۔ وہ موٹا سا چھوکرا باہر والا" خان نے بے پروائی

دکھلاتے ہوئے سوال کیا۔

"صاب! وہ ملاباری چھوکرا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ فوراً سے بھاگ گیا صاب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا ماں گریب بدھوا سب طریقے کو رونا پھرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صاب پہلے بوت چانگلا (بہت اچھا) چھوکرا تھا پر ساب بعد کو خراب ہوگیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور صاب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اور صاحب کے کانوں میں جیسے مسلی ہوئی تتلیاں اڑ گئیں۔ اس نے آگے کچھ نہیں سنا۔ اس کا جی اندر ہی اندر جل رہا تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ چائے پینے کے فوراً ہی بعد اپنی بیوی کو خط لکھنے بیٹھ جائے گا۔ تاکہ وہ خط پاتے ہی پہلی ٹرین سے چل پڑے۔

× × × ×

خان پلے ہاؤس کے ایک سنیما سے آخری شو دیکھ کر نکلا۔ "پلے ہاؤس" بمبئی کی بدنام جگہوں میں سے ایک ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر کبھی کبھی جانے وہاں اچھی اچھی تصویریں کیسے لگ جاتیں اور اپٹوڈیٹ لوگوں کو بھی وہاں جانا پڑ جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خان کو سڑک کے دوسری طرف کھڑی وکٹوریہ گاڑی تک پہنچنے کی جلدی تھی جس کی طرف ایک سپاہی جوڑا بڑھ رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسے اپنی بیوی کی تنہائی اور پریشانی کا خیال تھا۔ جھٹ اطلاع دیئے بغیر وہ ایک دوست کے اصرار پر سنیما دیکھنے

چلا آیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ وکٹوریہ گاڑی تک پہنچا کوئی اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ موٹا سا گدا . . . . . خان کا جی چاہا، کہ وہ ٹانگوں سے لپٹنے والے کو گرا کر روندتا ہوا اس وکٹوریہ گاڑی تک پہنچ جائے جسے عیسائی جوڑا چکار رہا تھا۔ اب وہ گھر کیسے پہنچے گا۔ جانے کوئی اور سواری ملے یا نہیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا وکٹوریہ اس جوڑے کو لیکر رینگ گئی . . . . . .

خان کا جسم ڈھیلا پڑ گیا اس نے غصّے سے سر جھکا کر نیچے دیکھا۔ لپٹنے والا ننّھا بابر والا تھا۔ مسکراہٹ کے ساتھ رال اس کی بانچھوں میں اب بھی کانپ رہی تھی۔

" فنیں . . . . ." یہ خوشی کا اظہار تھا۔

" اوہ تم . . . . خان کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ ننھے بابر والے نے اسکا ہاتھ پکڑ کر اپنے رخسار پہ رکھ لیا اور درد بھری مہین سی آواز میں بولا۔

صاب اب ام بابر والے کا کام نئی کرتا، ام کو رحیم نے رکھ لیا ہے۔" اس نے پان والے کی دوکان کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں ایک شخص کھڑا مونچھوں پہ تاؤ دے رہا تھا۔ سرخ رنگ کی کامدار واسکٹ اور ریشمی رومال گلے میں لپیٹے اس کی بغیر سفید نے کی تہ کی ٹوپی داہنی بھوں پر زیادہ جھک آئی تھی . . . . خان نے اسے دیکھا تو ایک جھرجھری سی لی . . . . خان کو خاموش دیکھ کے بابر والا کہتا رہا۔

"پر اب رحیم میرے کو جیادہ پیسہ نئی دیتا۔ میرا اکّا (رپیہ) اُلّو کا پٹا ہے اکّا دن . . . . . . صاب میرے کو رکھ لے نئی تو میرے کو پیسہ دے دے" باہر والے نے خان کا ہاتھ اپنے رخسار پر دبایا، جیسے وہ کہہ رہا ہو مجھے نوچو، مجھے کاٹو اور پھر مجھے کچھ پیسے دے دو . . . . .
لیکن خان ابھی کچھ سوچ بھی نہ پایا تھا کہ اتنے میں ایک ٹیکسی رکی اور وہ گھبرا کر اس کی طرف تیزی سے لپکا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں یہ بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

"دادر چلو" اس نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ اور ٹیکسی چل پڑی۔

"صاب . . . . . صاب . . . . ." ننھا باہر والا ٹیکسی کے پیچھے ہاتھ پھیلا کر رہ گیا۔

خان کے دل میں ایک کھٹک سی ہو رہی تھی۔

سونے سے پہلے خان نے اپنی گدبدی سی بیوی سے پوچھا۔ "میری جان! تمہیں میری کوئی حرکت بری تو نہیں لگتی . . . . . کوئی حرکت؟"

بیوی کسمسائی اور شاید شرمائی بھی ہو۔ کیونکہ اندھیرے میں اس کی

سانس قدرے تیز ہوگئی تھی۔

"بولو" خان پھر کہنے لگا۔

"آپ میرے آقا ہیں" بیوی نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا' اور خان قطعی مطمئن ہوگیا۔ اس کے دل کی کھٹک غائب ہوچکی تھی اور اب اس کی انگلیوں میں چٹکی لینے کے لئے چل ہو رہی تھی ——————

اس کا ہاتھ بیوی کے رخسار پر گیا تو نم ہوگیا۔ وہ چونک پڑا۔

"آنسو؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں جمائی آئی تھی" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"اچھا تو سو جاؤ" وہ بولا۔

کمرے میں ذیادیر کے لئے خاموشی طاری ہوگئی۔ پھر اچانک جیسے وہ کراہی۔

"میرے پاس ساریاں بہت کم ہیں، اب کی تنخواہ پر ضرور لا دیجیگا"

سرگوشیاں

گیتا! اے گیتا!!

دیکھو تو زمین پہ سیاہ دری بچھا کے سیتا پڑی سو رہی ہے، مگر کون کہ سکتا ہے کہ یہ سو رہی ہے، بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے شدتِ کرب میں بس آنکھیں مُند گئی ہوں۔ پرسوں سے یہ تمہاری تیمارداری کے لئے یہاں تمہارے پاس ہے لیکن کیسی ڈوبی ڈوبی سی رہتی ہے۔ کسی سے آنکھ نہیں ملاتی، تمہاری آنکھوں میں آنکھیں نہیں ڈالتی ——————

جیسے اسی سے کوئی قصور ہو گیا ہو۔ جوانی لڑکپن کے ہونٹوں سے ابھی پورا رس نہیں چوس سکی ہے۔ مگر پھر بھی جب تمہاری ان معصوم صورت بہن کے احساسات رہ رہ کر اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں رقصیں ہوتی

سن کر جھلملاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تم سے زیادہ دنیا کو سمجھ لیا ہے۔ لیکن تم گیتا رانی ۔ اف بھئی تم تو جیسے مافوق الفطرت ہو گئی ہو۔ یہاں آ کر ــــــ پرسوں رات بھر جھبڑی لیڈی ڈاکٹر اور دوسری دائیوں نے تمہارے سانچے میں ڈھلے ہوئے سلونے اور کچی مٹی کے سے سوندھے جسم کے ساتھ کیا کیا نہ زیادتیاں کیں، کیسی کیسی لپ جھپ نہ دکھائی ــــــ مگر تمہاری آنکھوں میں غصہ، یا ندامت کا مخبر ایک بھی آنسو تو نہ آیا ــــــ عجب عورت ہو تم! تمہارے متعلق سب کا یہی خیال ہے۔ مگر یہ بھی سن لو کہ عجیب ہونا کوئی فخر کی بات نہیں ہے!

ــــــ اب دیکھو تم سر شام سے یوں پڑی ہوئی ہو کہ نہ سو رہی ہو نہ جاگ رہی ہو۔ تمہاری آنکھیں کتنی عجیب سی ہو رہی ہیں ـــ ہاں وہ آنکھیں عجیب ہی تو لگتی ہیں جن میں کچھ نہ ہو۔ حیرت نہیں، خوف نہیں، حیا نہیں، آنسو نہیں، نیند نہیں ــــــ جن میں کوئی اُمید نہ ہو یاس نہ ہو، جن میں کوئی خیال نہ کسمائے، کوئی جذبہ نہ انگڑائی لے۔ بس گیتا! ایسا لگ رہا ہے کہ یہ تمہاری آنکھیں نہیں ہیں بلکہ پہاڑ کے کسی اندھیرے غار میں پانی کے دو ایسے گڑھے ہیں جن میں تازہ ہوا کے کسی جھونکے نے آج تک کوئی لرزش نہیں پیدا کی آج تک کوئی ہلکورہ نہیں دیا ـ اور پھر ان عجیب سی آنکھوں پر تمہاری لمبی لمبی گھنی پلکیں

کیسی ٹھٹکی ہوئی سی استادہ ہیں ـــــ آخر تمہاری پلکیں اتنی دیر سے جھپکتی کیوں نہیں۔ مانو تمہاری پلکیں ایسی ہو رہی ہیں جیسے میلے اور ویران دریچوں پر چڑھی ہوئی وہ بیلیں جو سخت لو دھوپ میں جل کر خشک ہو چکی ہوں ـــــ اُف یہ آنکھیں! یہ پلکیں! انہیں دیکھ کر ذہن میں کسی ایسے اجاڑ ٹوٹے پھوٹے محل کا تصور رینگ آتا ہے، جس کے پھاٹک پر سنگ سیاہ سے تراشے ہوئے دو بُت استادہ ہوں۔ ویرانیوں اور نحوستوں کے محافظ! ـــــ خدا کے لئے گیتا! ذرا تو حرکت کرنے دو اپنی پلکوں کو، اپنی آنکھوں کو ـــــ یہ پلکیں۔ یہ آنکھیں ہی تو تمہارے جسم، تمہاری روح، تمہاری حیات کا عنوان ہیں۔ یہی اتنی مردہ ہو جائیں گی تو کیا ہوگا؟ ابھی ابھی کونین ارگٹ مکسچر کا ایک ڈوز تم نے اس طرح حلق سے نیچے اتار لیا جیسے اپنے منہ میں آیا ہوا پانی نگل لیا جاتا ہے۔ اس کی کڑواہٹ نے کبھی تمہاری آنکھوں میں زندگی نہ پیدا کی، ایک ذرا سی بیزاری ہی چمک اٹھتی ـــــ ایک ہلکی سی اکتاہٹ ہی جھانک لیتی ـــــ آگ لاکھ بجھا دی جائے مگر راکھ میں دیر تک گرمی رہتی ہے ـــــ مگر تم نے تو جیسے ایک دم اپنی آنکھوں، اپنی حیات کے ان دو روزنوں کو سیسہ پلا دیا ہے۔ بیچ میں لوہے کی دیوار کھڑی کر دی ہے۔ تم نے اپنے جی میں ٹھانی کیا ہے گیتا؟

تم یوں اسپتال کے بستر پر لیٹ کر پتھر کی دیوی تو بننے سے رہیں، زمانہ بہت گزر چکا ہے اور بہت سے زمانے خواب بن چکے ہیں، پتھر سے پہلے کا زمانہ گزر گیا، پتھر کا زمانہ بھی بیت گیا، اور پتھر کی دیویوں کا زمانہ بھی گزر رہا ہے ـــــ ریل میں بیٹھ کر پیچھے بھاگتے ہوئے نظاروں میں جی کیا الجھانا؟ سانچے میں ڈھلے ہوئے اپنے جسم کو دیکھو، جو گوشت پوست سے بنا ہے، جو بھگوان کے چرنوں میں جھک سکتا ہے، عقیدت سے بھرا ہوا رقص کر سکتا ہے۔ اور جو بھگوان داس کی بانہوں میں لچک سکتا ہے، کانپ سکتا ہے ـــــ کتنی توہین ہوگی تمہارے جسم کی اگر یہ پتھر میں تبدیل ہو جائے؟ اور پھر ایسی حالت میں جبکہ ان دنوں پتھر پوجے جانے سے زیادہ ایک دوسرے کا سر پھوڑنے کے کام آتے ہیں۔ تم تو جیسے یہ بھول ہی گئی ہو کہ آج سہ پہر کو تمہارے سوکھے سہمے اور دل شکستہ بھائی کا سر ایک ایسے پتھر سے پھٹ گیا جس پر پوجا کا سیندور لگا ہوا تھا ـــــ ذرا سوچو تو تم تھیا سوفیکل کالج کی پرنسپل (جو عدم تشدد کی بھی حامی ہو) کسی کے سر پہ اٹھا کر اس طرح دے ماری جاؤ کہ تم کسی کے گرم گرم خون میں نہا جاؤ ـــــ ـــــ دیکھو! تم کو تو اس خیال ہی سے پھریریاں آنی چاہئیں۔ اور پھر یہ بھی بھولنے کی بات نہیں کہ تم دیوی بننے کے دو چار سے

قبل باوجود خواہش کے اس کا سر نہ پھوڑ سکیں جس نے تمہارا نصیب
پھوڑ دیا۔ اس لئے اے گیتا رانی! پتھر کے اس حصار سے کود کر باہر نکل
آؤ۔ ورنہ تمہارا دم گھٹ جائے گا اور تم مر جاؤ گی ——— تمہارا یہ
جسم اٹھا کر منوں لکڑیوں کے ڈھیر پہ رکھ کر پھونک دیا جائے گا اور
اس کے بعد اطمینان رکھو کہ تمہاری مورتی بھی نہیں بنے گی، تمہاری
پوجا بھی نہیں ہوگی، کیونکہ لے تھیاسوفیکل کالج کی پرنسپل سائنس ترقی
کر کے اٹیم بم بن چکی ہے اور آکاش پہ بیکار دیوی دیوتا آپس میں
جھگڑنے لگے ہیں کہ بے شمار انسانوں کی دنیا میں اب فی دیوتا ایک پجاری
بھی نہیں پڑ رہا ہے ——— ظاہر ہے کہ وہاں گنجائش نہیں ہے اور
پھر گیتا، آکاش کو تمہاری اتنی ضرورت ہرگز نہیں جتنی کہ تمہارے
کنبے کو ہے۔ اس کا احساس تمہیں پہلے بھی تھا اور اب بھی ہونا چاہئے
تمہیں وہ تجربہ تو یاد ہی ہو گا کہ تمہارے ضرورت مند کنبے کے سامنے
تمہارے عاشق کو بھی اپنی ضرورت ماند معلوم ہوتی تھی۔ آہ وہ ایثار
پیشہ عاشق شیام ——— وہ یونیورسٹی میں تمہارے ساتھ ہی تو پڑھتا
تھا اور تمہارے حسن اور تمہاری سادگی پر دم دیتا تھا۔ کم از کم تم نے تو اکثر
یہی محسوس کیا تھا کہ وہ تم پہ دم دے رہا ہے۔ جب وہ تمہارے
ملائم اور گرم ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا۔ جب وہ تمہارا سلونا چہرہ

اپنی ہتھیلیوں میں ہولے سے دبا لیتا جب وہ تمہارے نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیتا تو تم اس کی بند آنکھوں اور کانپتے ہونٹوں کو دیکھ کر یہی اندازہ لگاتی تھیں ـــــــ مگر جب تم نے ایک چاندنی رات میں گومتی کے پہلو میں سوئی ہوئی سڑک پر اس کے ساتھ چلتے ہوئے شادی کی بات چھیڑی تھی۔ تو اس نے تمہیں کتنے پیار سے، کتنی عاجزی سے ایک طویل بوسہ بخشتے ہوئے، بتایا تھا کہ وہ تم سے شادی نہیں کر سکتا کیونکہ تم اپنے کنبے کے لئے بے حد قیمتی ہو، اتنی قیمتی جتنی کسی مزدور عورت کے لئے حضرت گنج کی کسی دوکان کے شوکیس میں لٹکی ہوئی زر کار ساری آہ! گومتی کے کنارے، چاندنی رات میں، اونچے اونچے درختوں کے نیم تاریک سایوں میں تمہارے عاشق کا کیسا زبردست ایثار؟ ہاں تو لے زر کار ساری کی طرح قیمتی گیتا! زندہ رہنے کی سوچو اور اپنے کنبے کی عریانی پر پردہ بنی رہو۔ کیونکہ تمہاری بہن سیتا ابھی تک جوان ہو کر زر کار ساری نہیں بنی ہے۔ تمہارے دونوں بھائیوں میں سے ایک بھی تندرست ہو کر نہ کلرک بن سکا اور نہ آئی۔ سی۔ ایس ـــــ تمہاری ماں کے دمے پر اب تک کوئی فقیری دوا اثر نہ کر سکی اور نہ تمہارے باپ کی لنگڑی ٹانگ آج تک سیدھی ہو سکی۔ تمہاری بڑی بیوہ بہن اب تک اپنے قول کے مطابق مر کر سہاگن نہیں ہو سکی ہے ـــــ سمجھیں؟

اس لیۓ اپنی ساکت پلکیں جھپکاؤ، اپنے سفید سفید دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹو اور اس حقیقت پر کڑھ کر رونے لگو ـــــ مگر تم تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہی ہو!

گیتا! اے گیتا رانی!!

بتاؤ تو تم بستر پر اس طرح لیٹی ہوئی کھڑکی سے باہر کس موہوم نقطے پر اپنی پتلیاں ٹانکے ہوئے ہو؟ سبھی نقطے مطلب کے نہیں ہوتے قلم روشنائی میں ڈبو کر لکھنے بیٹھو اور سخت نب پہ زور دے کر کھینچو، تو یوں ہی کتنے ہی بے معنے نقطے کاغذ پہ پھیل جاتے ہیں ـــــ اس لیۓ نقطے نہیں گھورا کرتے! کچھ اور بھی دیکھو! ـــــ آسمان کو دیکھو، جس سے تمہیں بہت لو لگی رہتی تھی، آنسوؤں کی طرح ڈبڈبائے تاروں کو دیکھو، جنہیں گن گن کر تم نے اکثر سونے کی کوشش کی ہے۔ چاند کو دیکھو، جس کی روشنی تمہارے بستر سے زیادہ سفید ہے اور جس کی سفیدی میں خزاں کی ماری ہوئی پتیوں کی زردی بھی حل ہے اور اس دو تولے سونے کی پیلاہٹ بھی گھلی ہوئی ہے۔ جس کی مالا بنوانے کی تمہیں عرصے سے آرزو تھی۔ اور تمہارے چہرے پر رچی ہوئی ہلدی کی جھلک بھی ـــــ اس چاند ہی میں بہت کچھ ہے۔ یہی دیکھو ـــــ بور سے لدے ہوئے آم کے درختوں پر کتنا اداس نظر آرہا ہے بے چارہ چاند! ـــــ

کچھ ایسا لگتا ہے جیسے اس چاند کو بندرابن کی وہ پورنماشی یاد آ رہی ہو جس میں رادھا اور گوپیوں کی روحوں کی وہ روشنی جو گائے کے مکھن کی طرح سفید تھی اور دھڑکتی ہوئی محبت کے وہ ملبوس جنہوں نے انکی عریانیوں کو ڈھانپ رکھا تھا، ایک دم چوری ہو گئے تھے اور وہ پگلیاں اب جمنا کنارے بھٹک رہی تھیں ——— کانوں میں بسی ہوئی بنسری کی تانوں پر لپک رہی تھیں اور الجھی الجھی سانسوں، بھیگی بھیگی آہوں میں جیسے پکارتی پھر رہی تھی "کون گلی گیو شام" ——— اُفوہ کیسی بے تابانہ پکار تھی۔ اس پکار کو میرا نے اپنے گیتوں کی روح بنایا۔ اور جسے تم ہر رات کیرتن میں گایا کرتی تھیں۔ کون گلی گیو شام بتا دے کوئی کون گلی گیو شام ———

اپنی تیلی تیلی بھوؤں، اُن نازک سیاہ توسوں کو تان کر ذرا سوچو تو ان بھیگتی رس میں ڈوبی ہوئی ابتدائی راتوں کو ——— وہ راتیں تو تمہاری ہستی کے اندھیرے میں آج بھی اسی طرح چمکتی ہیں جیسے بہت سے جگنوؤں کو پکڑ کر ان کی مالا گوندھ کر اندھیری کوٹھڑی میں لٹکا دی جائے ——— ہو سکتا ہے کہ ان تین دنوں میں تمہیں جاننے والے تمہاری ہستی کے گرد لپٹی ہوئی اس جگمگاہٹ کو بھول گئے ہوں۔ مگر تم تو نہ بھولی ہوگی؟ ——— وہ بھیا سیکل سا نیچ تال۔ ہائے وہ قوس قزح کی

بستی جس کی چھت ایک لمبی چوڑی قوس قزح کے مانند تھی۔ ایسی قوس قزح جس کے رنگوں میں سونے چاندی کی چمک جھلکتی جس کی دیواروں پہ ہلکے ہلکے رنگ نازک نازک کمانوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے جس کی سیٹیں قوسوں کی طرح ترتیب دی ہوئی تھیں اور وہ چھوٹا سا محرابی اسٹیج جس کے درمیان کرشن بھگوان کی مورتی رکھی رہتی۔ بنسری کی اوٹ میں مسکراتی ہوئی مورتی۔ کیرتن شروع ہونے سے چند منٹ قبل تم سستی کی سفید ساڑی میں بنگالی انداز سے بیٹھی ہوئی، پروقار سادگی سے لبریز چال چلتی اسٹیج پہ آتیں اور مورتی کے قریب آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتیں اور ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی نظروں کے لئے مقناطیس بن جاتیں۔ اسٹیج پہ اور بھی تو ہوتے ہوسٹل کی اکثر لڑکیاں اور اسٹاف کی دوسری عورتیں اور مرد ــــ مس ٹھاکر جن کے چہرے کا میک آپ کسی وقت بھی نہ اترتا اور جو اسٹیج پہ فلم ہیروئن کی طرح جاذب نظر دکھائی دیتیں ــــ مسز شنکر جو اپنے چوڑے کولہوں، نچلے موٹے ہونٹ اور گہرے سانولے رنگ کی وجہ سے اجنتا کی نقاشی کا نمونہ نظر آتیں مس داس جو اپنے سرخ و سفید رنگ اور ناٹے قد کی وجہ سے بالکل سیلولائیڈ کی گڑیا لگتیں، اور وہ لمبی گردن اور کبڑی پیٹھ والے جتین ماما جن کا کالج میں شروع ہی سے بہت عمل دخل رہا۔ ان کے علاوہ بھگوان داس، کالج کے آفس کا ایک کلرک جس کا گول چہرہ گہرا سانولا تھا اور ایک آنکھ میں ہلکا سا کچھ تھا جو سنہرے فریم کی عینک سے چھپا سا رہتا ــــ

مگر ان سب میں گھلی ملی ہونے کے باوجود تم کتنی الگ تھلگ نظر آتیں۔ بالکل ندی کے سینے پر کھلے ہوئے کنول کی طرح!۔۔۔ کہتے ہیں کہ شراب جتنی پرانی، اتنی ہی نشہ آور!۔۔۔ ہوتی ہوگی، مگر یہ حقیقت ہے کہ اسٹیج پر تمام لوگوں میں تمہیں ایک ایسی تھیں کہ پہلی نظر میں تم جیسی نظر آتیں، دوسری نظر میں اس سے بہتر، اور تیسری میں بہترین اور دیکھتے دیکھتے تمہارا حسن آکاش کا قیمتی تحفہ لگنے لگتا۔۔۔ مس ٹھاکر جو تمہارے سامنے آکر بے بس سی نظر آتی اور جو دل ہی دل میں تمہاری عزت اور وقار سے کڑھتی تھی، تمہارے لئے کہا کرتی تھی کہ تمہاری گہری مذہبیت نے تم میں ایک روحانی افسردگی پیدا کر دی ہے بس یہی تمہارا حسن ہے ورنہ تم ایک کالی کلوٹی مدقوق سی عورت ہو۔

مدھو کے گلے میں جب ہار پڑ جاتا تو جنین ماما ہارمونیم چھیڑ دیتے، بھگوان داس ستار کے تاروں پر انگلیاں دوڑانے لگتا۔ مسٹر مشنکر طبلے پر اپنی پتلی پتلی انگلیاں اور گدگدی ہتھیلی تھرکانے لگتی۔۔۔ مس داس پیتل کی ننھی ننھی مجیریاں کم عمر لڑکیوں کی طرح شوق سے اٹھا کر ٹنٹنانا شروع کر دیتی اور تم دونوں ہاتھوں میں کھڑتالیں لے کر جھنجھنانے لگتیں اور سب کے درمیان مس ٹھاکر ایک حسین لچھ دار لہرے کی طرح بیٹھ جاتی جیسے اسی کے اعزاز میں کیرتن ہو رہا ہو۔

سازسنگیت کی ندی میں ننھی ننھی لہریں ابھرتیں اور ہال میں بیٹھنے والے ہولے ہولے جھومنے لگتے —— پھر آہستہ آہستہ وہ ننھی ننھی لہریں آپس میں لپٹ لپٹ کر اونچی ہوتی جاتیں، بھپر بھپر کی لپکتیں، اچھل اچھل کر بڑھتیں —— لوگ زور زور سے جھومنے لگتے۔ ہال کے فرش پر اور کرسیوں کے ہتھوں پر بے اختیارانہ تال کی دھپ دھپ اور کھپ تھپ جھونپڑیوں کی آگ کی طرح تیزی سے بڑھتی ہی جاتی۔ اور پھر جیسے ایک بھنور سا پڑ جاتا۔ راگ اور تال کا ایک ایسا بھنور جس میں گویا ہر چیز چکرانے لگتی، ہر شخص گھومنے لگتا —— پھر آہستہ آہستہ اس بھنور میں تمہاری تیز لیکن ریشم کی سی ملائم آواز، سفید سچی سیپ کی طرح چکراتی ابھرتی۔ کون گلی گیو شام —— تمہارا محبوب بھجن بھنور سا کٹ ہو جاتا اور تمہاری آواز ہال میں اس طرح چھا جاتی جس طرح اگربتی کے دھوئیں کی خوشبو —— دوسری آوازیں اور ساز تمہاری آواز کو اس ہم آہنگی اور سلیقے سے جلو میں لے لیتے جیسے کسی الف لیلائی شہزادی کو اس کی کنیزیں۔ سنگیت کی بزم روندی میں سننے والوں کی روحیں ہلکی پھلکی رنگین کشتیوں کی طرح ڈولنے لگتیں۔ دھیمے دھیمے، مزے مزے سے —— اور آنکھیں تم پر ٹنک کر رہ جاتیں۔ ہال میں رچی بسی ہوئی رنگین قوسوں کے رنگ جیسے بجھ کر رہ جاتے اور سونے چاندی کی سی چمک گہری ہو

جاتی ـــــ بس ہر طرف ایک جگمگاہٹ ۔ تمہارے سلونے جسم پر لپٹی
ہوئی سفید ساڑی مکھن سے بھی زیادہ سفید نظر آتی اور تمہارے سیاہ جوڑے،
میں لپٹی ہوئی گلاب کی سرخ اور پیلی کلیاں جیسے کھلنے لگتیں ـــــ
تمہارا گاتا ہوا چہرہ مورتی کی طرف اٹھا ہوا کتنا بھلا معلوم ہوتا ۔ تمہاری
بھیگی بھیگی مست آنکھیں، تمہاری کھڑی کھڑی پتلی سی ناک، تمہارے
ملائم نم ہونٹ، چمچماتے ہوئے ہموار دانت اور تمہارے کھلے ہوئے ماتھے
پر وہ سرخ بندی ۔ ہر چیز نکھری ستھری ـــــ تمہارے حسن پر پاکیزگی
اس طرح امنڈ پڑتی جس طرح ساحل سمندر پر سفید جھاگ ۔ کرشن بھگوان
کی مورتی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہو جاتی جسے تم محسوس کرتیں
اور بھگوان داس کی آنکھیں عینک کے شیشوں کے پیچھے کھلکھلا اٹھتیں
جو تم نہ دیکھ سکتیں ـــــ ہال میں بیٹھنے والے اکثر بڈھے سادے
لوگ اپنے کلبلاتے ہوئے جذبات کی نالیوں پر پتھر رکھ کر کہتے کہ اس
سمے تم سچ مچ ایک ایسی پاکیزہ روح لگتیں جو بھگتی کی تلاش میں سرگرداں
ہو! ـــــ ہائے وہ بھگتی جس کا کہیں وجود نہیں ۔ چہ چہ! کیوں
ٹھیک ہے نا گیتا؟ جواب دو ۔ مانا کہ تم سدا کی کم گو ہو اور تمہیں کنفیوشس
کا یہ قول بہت پسند ہے کہ چپ رہنا دیوتاؤں کی شان ہے ۔ مگر ـــــ
تو تمہیں یقین ہو جانا چاہئے کہ تم دیوی یا دیوتا کی قسم کی چیز نہیں ہو ٹھیک

محض نگیستا ہو ——— وہ گیتا جس کے لئے ڈاکٹر کا خیال ہے۔ کہ اگر چند گھنٹے اور یوں ہی چپ طاری رہی تو دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی اس سے کیا فائدہ ہوگا گیتا ؟ لوگ کہیں گے اچھا ہوا پاپ کٹا۔ کتنی ہتک ہے کہ دنیا تمہارے جنازے کو اپنے دامن پر سے یوں کراہت سے جھٹک دے جیسے کوئی مکڑی کو جھٹک دیتا ہے۔ ہے نا ہتک ؟—— مگر اف تم تو جیسے پتھر پر ابھرا ہوا نقش ہو۔ تم تو جیسے ماضی، حال اور مستقبل کی حدوں سے بہت دور نکل چکی ہو۔ سب کچھ بھول چکی ہو—— سب کچھ کھو چکی ہو! ——

گیتا! اے گیتا!!

کہاں ہو تم گیتا؟ بولو کیا واقعی تم سب کچھ بھول چکی ہو، یا بھول جانا چاہتی ہو؟ اچھا بتاؤ تو کیا تم اس رات کو بھی بھول گئیں ——— وہی رات جس میں تم بہت اداس تھیں۔ اتنی اداس کہ تمہاری سنجیدگی اور گہرائی کے ہوتے ہوئے بھی دیکھنے والے سمجھ گئے کہ تم اداس ہو غیر معمولی طور پر دکھی ——— ہاں اسی دن دوپہر کو تمہیں تمہاری ایک جان پہچان کی لڑکی نے خط میں اطلاع دی تھی کہ شیام کی شادی ایک ایسی بدصورت بنگالن سے ہو گئی ہے جو اپنے ساتھ تیس ہزار روپے جہیز لائی ہے اور دس ہزار نقد۔ یعنی شیام نے ایک ایسی لڑکی سے شادی کر لی

جو اپنے گھر کے لیے قیمتی نہ تھی بلکہ اس کا گھر اس کے لیے قیمتی تھا۔

اس دن تم کیرتن میں کتنی تھکی ہوئی اور نڈھال تھیں۔ تم نے اپنے لمبے لمبے بالوں کا جوڑا ابھی نہیں باندھا تھا اور نہ گلاب کی سرخ اور پیلی کلیاں۔ تمہارے ماتھے پر باسی بندی مٹی مٹی سی تھی ــــــ ظاہر ہے کہ سات سال پہلے ہی شام تمہارا ہاتھ جھٹک چکا تھا اور اس نے تمہیں ایک ایسی حقیقت سے روشناس کرایا تھا جس میں تم سانس لے رہی تھیں لیکن آنکھیں بند کر کے ــــــ اس نے تمہاری آنکھیں کھول دیں۔ اس کا احساس اس وقت تمہیں خصوصیت سے ہوتا جب تمہاری تنخواہ کے دو سو روپے مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی گھر میں چٹ ہو جاتے ــــــ مگر پھر بھی اس کی شادی کی خبر سے تم ایسی حالت کو پہنچ گئی تھیں جیسے اپنے کسی بہت ہی پیارے کی چتا کے شعلوں کا ناچ دیکھ رہی ہو۔ شاید اس لیے کہ محبت مکڑی کا ایسا جالا ہے جو اگر کونوں کھدروں میں گھسنے پر جسم سے چمٹ جائے تو چھڑانے کے باوجود کہیں نہ کہیں ذرا بہت چپکا ہی رہ جاتا ہے ــــــ اس دن تم نے کیرتن شروع کرنے سے انکار کر دیا۔ تم سے مرعوب رہنے والی دوسری لڑکیاں گانے لگیں ــــــ اپنی اپنی پسند کے بھجن اور تم چپ چاپ کرشن بھگوان کی مورتی کو تکتی رہیں۔ بس جیسے تمہیں سکتہ ہو گیا ہو ــــــ مگر نہیں اس

دوران میں تمہاری ممدوح اس بڑے سے پتھر کی مانند بے چین تھی جو پہاڑ کی چوٹی سے لڑھک رہا ہو —— تمہیں کرشن بھگوان کی مورتی کے پس منظر میں شیام کی صورت بار بار ابھرتی نظر آتی۔ اس کی ایک ایک بات، اس کے چومنے کا انداز، آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی ڈھٹائی اس کی مسکراہٹ، اس کا گانا —— ٹیگور کے وہ گیت جو اس نے تمہارے بالوں سے کھیل کھیل کر سنائے تھے۔ نذرالاسلام کے وہ انقلابی نغمے جن میں پرانے نظام کی دھجیاں اُڑتیں، وہ جو تمہیں خطوں میں لکھ لکھ بھیجتا، جبکہ تم اس سے کھلم کھلا ملتے ہوئے گھبراتیں —— اور پھر ان سب کے بعد پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر دھکا —— تمہیں ایک ایک چیز یاد آرہی تھی۔ اور لڑکیاں جھوم جھوم کر گارہی تھیں :-

ہری ہری بول۔ ہری ہری بول۔

کیرتن ختم ہوگیا —— سُننے والے رخصت ہوگئے۔ لڑکیاں ہوسٹل میں چلی گئیں۔ مس داس اور مس ٹھاکر کھسر پھسر کرتی بیتابی سے اُٹھ گئیں۔ مسز مشتاک جینن ماما کے پیچھے پیچھے اپنے سرمئی شال میں لپٹی باہر نکل گئیں، کیونکہ انہیں بدلی بوندی کی راتوں میں اپنے کوارٹر تک تنہا جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا —— اگر تم وہاں سے نہ اٹھیں، تم سے کچھ کہنے یا پوچھنے کی کسی کو ہمّت نہ ہوئی۔ بس تم یوں ہی ڈوبی ہوئی

سی مورتی کے سامنے بیٹھی رہیں ——— بھگوان داس کے ستار کے تار شاید کچھ ڈھیلے ہو گئے تھے اس لئے وہ اب تک ایک طرف بیٹھا ان ہیں الجھا ہوا تھا۔ لیکن جب وہ ستار اٹھا کر چلا گیا تو تم نے بے تابی سے مورتی کے قدموں پر اپنا ٹھنڈا رخسار رکھ دیا اور ایک دم سے بہت سے آنسوؤں نے مورتی کے قدموں کو دھو دیا ——— مورتی مسکرا رہی تھی، کیونکہ وہ مسکرانے ہی کے لئے بنی تھی اور تم رو رہی تھیں ——— بھگوان سے شکایتوں کا ایک طوفان اندر چیخ رہا تھا۔ بھگوان تم نے کچھ نہیں دیا اپنی پجارن کو، سوائے آنسوؤں کے ——— وہ آنسو جو اندر ہی اندر اوٹتے ہیں، وہ آنسو جو آج آنکھوں سے پھوٹ کر تمہارے چرن دھو رہے ہیں ——— تم نے شیام کو بازی جیتنے لے جانے دی۔ وہ شیام جس نے تمہاری پجارن کو پہاڑ کی چوٹی سے دھکا دے دیا! ——— تم روتی رہیں۔ مورتی مسکراتی رہی اور آہستہ آہستہ چل کر اندر آتے ہوئے بھگوان داس کی آنکھیں عینک کے پیچھے ناچ ناچ کر ہنس رہی تھیں ——— تم نے سر اٹھایا وہ گھبرا کر کھڑتالیں اور مجیریاں بٹورنے لگا۔ اور تم ناگواری محسوس کرتی ہوئی ہال سے نکل آئیں باہر کی ٹھٹھری ہوئی فضا اور گیلی زمین کی چپ چپ سے تمہیں محسوس ہوا کہ تمہارے قلب پر رکھا ہوا بوجھ اور بھاری ہو گیا ہے ——— تم لمبے

لمبے برآمدے اور دالان طے کر کے اپنے کوارٹر میں داخل ہوئیں اور بغیر کچھ کھائے پیے اپنے کمرے میں آ کر اُجلے بستر پہ پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئیں ــــــ تمہارے برابر کے پلنگ پر سیتا بے سُدھ سو رہی تھی ۔ اس کے سرہانے اس کے کورس کی کتابیں پھیلی پڑی تھیں ۔ تمہاری نگاہیں اس کے بھولے بھالے چہرے پر جم گئیں ــــــ مگر تمہارا ذہن جیسے تھک کر سو گیا تھا ۔ اس وقت کوئی بھی واضح خیال تمہارے شعور میں نہ تھا بس تم بیٹھی تھیں بیٹھی رہیں ــــــ تمہیں سیتا کو دیکھ کر آج مارے محبّت کے یہ خیال نہ آیا کہ تم اس کی شادی جتنی جلدی ہو سکے کر دو گی، تاکہ اپنے کنبے کے لئے یہ زر کار ساری نہ بن سکے ۔ اور نہ تم نے اپنے دونوں دائم المرض بھائیوں کے لئے ہی کچھ سوچا جنہیں تم تندرست اور کماتے کھاتے دیکھنے کی متمنی تھیں ــــــ نہ تمہیں اپنی بیوہ بہن ہی کا خیال آیا جو آج تک مر کر سہاگن نہ ہو سکی تھی ۔ تمہیں اس وقت اپنے ماں باپ بھی نہ یاد آئے جو تم سے روگ بن کر چمٹے ہوئے تھے ــــــ اور یہ بھی کتنی عجیب بات تھی کہ اس دن تم نے جاگتے میں وہ خواب بھی نہ دیکھا جب کہ تمہیں اچانک اتنی بہت سی دولت مل گئی ہے کہ تمہارے کنبے کے دلدر دور ہو گئے ہیں ــــــ اور تم بھاری ذمے داری کے بوجھ سے آزاد ہو کر اپنی برادری میں شیام سے کروڑوں درجے اچھا شوہر حاصل کر چکی

ہو ــــــ اور بن بابا شیام خوب گرجھ رہا ہے، پچھتا رہا ہے۔

کوئی خیال نہیں، کوئی خواب نہیں ــــــ بس تم یوں ہی چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ اپنے ہاتھ میں اپنی گود میں بے قدری سے ڈالے۔ ہاں مگر تم میں ایک احساس مجسم ہو گیا تھا اور وہ یہ کہ تم ہار گئی ہو۔ تم بہت پیچھے رہ گئی ہو۔ تم اب تک نری احمق بنی رہیں۔ تم خالی ہاتھ ہو۔

لان میں کھلنے والا کمرے کا دروازہ اور دونوں کھڑکیاں کھلی تھیں کھلی رہیں۔ بجلی کے قمقمے کے گرد پتنگے چکر کاٹ رہے تھے، مگر تم نے سوچ بھی اوف نہ کیا ــــــ بادل دھیمے دھیمے گرجنے لگے، اور پانی کی موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں، مگر تمہارا دھیان اس طرف بھی نہ گیا ــــــ تمہاری ماں کھانس کھانس کر، ہانپ ہانپ کر سو گئی، تم نے یہ بھی محسوس نہ کیا، دوسرے کمرے میں تمہاری بیوہ بہن نے رامائن کا پاٹھ بند کر دیا اور سارے کوارٹر میں سناٹا چھا گیا۔ دوسرے کوارٹر بھی خاموش ہو گئے۔ مگر تم پھر بھی نہ لیٹیں ــــــ تمہارے دروازے کے سامنے سے کوئی کئی بار دبے پاؤں گزرا، پر جیسے تم نے یہ بھی نہ دیکھا۔ پتہ نہیں کالج کی پرنسپل کا وہ ذمے دارانہ وقار، کہاں غائب ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے سب اس سے مرعوب رہتے۔ اتنی رات گئے کوئی مرد اس کے دروازے کے چکر لگائے اور وہ بھی اسے بیٹھے

دیکھ کر؟ مگر تم کچھ یوں بیٹھی رہیں جیسے بھاری بوجھ تلے دبی ہوئی ہو۔ وہ بوجھ کے ساتھ، اس کا تجزیہ کرنے کی تم میں صلاحیت نہیں تھی۔

پھر نہ جانے کیوں اور کیسے بھگوان داس تمہارے کھلے دروازے کی چوکھٹ پر آکھڑا ہوا۔ اس کی قدرے بھینگی آنکھیں عینک کے پیچھے ایسی ہو رہی تھیں جیسے وہ کسی کو حمام میں نہاتے دیکھ رہا ہو۔ اس کا سانولا رنگ تاریک ہو رہا تھا اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ بھیگی بھیگی ہوا میں اس کا کھادی کا کرتہ اور دھوتی پھڑ پھڑا رہے تھے۔ لمبے خشک بال اُڑ رہے تھے۔ تم نے اسے دیکھا تو یکلخت کھڑی ہوگئیں۔ تم اسے ڈانٹنا چاہتی تھیں، تم اسے ملازمت سے برخاست کرانا چاہتی تھیں یا ——— تمہارے ماؤف دماغ نے تمہیں کوئی راہ نہ سجھائی۔ اور پھر پتہ نہیں کیسے بجلی کا قمقمہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ اور تم دونوں قریب آگئے ——— اس کی باہوں نے تمہیں جکڑ لیا۔ تمہارے لمبے لمبے بالوں نے اس کی باہوں کو اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے پرندے سے دیکھ سکے۔

رات کے اندھیرے میں تم عجیب سی، انوکھی سی غنودگی میں نت نئے غیر مربوط سے خواب دیکھتی رہیں۔ چھنا چھن۔ چھنا چھن، تمنا تٹ پر جیسے گوپیاں ناچ رہی ہوں، مست اور بے خود اور جمنا میں رنگین منقش گاگریں بہہ رہی ہوں۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں بنسری بج رہی ہو ——— کنجن میں

پائل چھنک اٹھتی ہو، اور بندرابن کی پگڈنڈیوں پر موٹے موٹے کالے سانپ اینڈ رہے ہوں اور پھر کہیں تمہارا شیام اپنی بدصورت بیوی کے جھگڑوں جہیز تلے دبا چیخیں مار رہا ہو ——— اور تم گوپیوں جیسا لباس پہنے چھپا چھپ وہی بلو کر مکھن نکال رہی ہو۔ سفید ملائم مکھن ——— ہنس رہی ہو، گا رہی ہو۔ اور تمہاری چوڑیوں کی کھنک پر موٹے موٹے ناگ جھوم رہے ہوں۔ پھر تم نے دیکھا کہ متھانی میں لپٹی ہوئی رسی بھی ایک کالا ناگ تھی جسے پکڑ کر تم وہی بلو رہی تھیں ——— تمہاری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی ——— جانے کیسے کیسے سنسنی پیدا کرنیوالے خواب تھے ——— اور کتنی عجیب رات تھی ———

رات بھر تھم تھم کر پانی برستا رہا، رہ رہ کر بجلی چمکتی رہی اور صبح ہوتے مطلع صاف ہو گیا ——— آسمان پر صبح کی روشنی نے تمہیں تمہارے بستر پر بیٹھی بیٹھی غنودگی میں مسکراتے پایا۔ ایک پراسرار تبسم جو تمہارے ہونٹوں پر زندگی میں پہلی بار آیا تھا۔ نیا، انوکھا اور ایسا بوجھل جیسے اپنے دامن میں چنبیلی کے پھول لئے ہو۔ آہا! ——— اب تو مسکرا دو گیتا، وہ رات تو اب تمہاری آنکھوں کے سامنے ہو گی۔ نہیں مسکراؤ گی؟

بھئی گیتا!!

گیتا! اے گیتا!!

اچھا پھر تمہیں یہ تو یاد ہی ہوگا کہ وہ بوجھل تبسّم کتنے دن تمہارے ہونٹوں پر رہا تھا ؟ یہی کوئی دو ڈیڑھ مہینے ۔ اور پھر تمہارے ہونٹ ہر وقت اس طرح مرتعش سے رہنے لگے تھے جس طرح اعصابی کمزوری میں مبتلا شخص کا خالی ہاتھ بوجھل چیز اٹھانے کے بعد کانپتا ہے ـــــ شاید تمہارے تبسّم میں بھی چنبیلی کے پھول خشک ہو کر ہوا میں اڑ گئے تھے۔ ہائے گیتا کیسی تلخ حقیقت ہے یہ ! ـــــ ہاں اور تمہیں وہ حقیقت سے بھی زیادہ کڑوی کڑوی دوائیں تو یاد ہی ہونگی نا جنہیں چھپ چھپ کر حلق سے نیچے اتارتے ہوئے تمہارا چہرہ اس طرح زرد ہو جاتا تھا جیسے تم اپنا ہی گوشت کاٹنے کے لئے چھری تیز کروائی جا رہی ہو ـــــ مگر تم سہمی ہوئی یہ بھی کر رہی تھیں ۔ بھگوان کرشن نے رادھا سے محبّت کی اور رادھا کو راجمل سے باغی بنا دیا، خوب خوب راس رچائے اور پھر اسے چھوڑ کر گوکل سے چلے گئے، کیونکہ ان کا اس کے علاوہ بھی ہمہ گرام تھا ـــــ بھگوان داس نے تمہیں تمہاری خواہش کے باوجود دن کی روشنی میں اپنانے سے انکار کر دیا، کیونکہ وہ دو بیٹیوں اور ایک دائم المریض بیوی کا پہلے ہی مالک تھا۔ اس نے پہلے تم سے ہاتھ جوڑ کر، تمہارے بال چوم کر کہا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے ۔ اس لئے وہ تمہیں بیوی نہیں بنا ئیگا کیونکہ اس کی آرزو ہے کہ تم کسی بڑے آدمی کی بیوی بنو اور شان سے رہو ـــــ

لیکن تم نے جب اپنے اوپر سادتری پن طاری کیا تو اس نے تمہیں سمجھایا کہ میرے اور تمہارے درمیان ایک تبادلہ ہوا تھا بس! اور یہ کیا عجیب ہے کہ گیہوں کا پکا کھیت خریدنے والے کو گیہوں کے ساتھ بھوسہ بھی مل جائے اس کے بعد تم اس سے کچھ نہ کہہ سکیں ــــــ عورت مرد سے کچھ نہ کہہ سکی ــــ کالج کی پرنسپل اپنے آفس کلرک سے کچھ نہ کہہ سکی ــــ حالانکہ تم کہنا چاہتی تھیں کہ تمہیں جو کچھ دیا گیا ہے یہ تو صرف اتنا ہے جیسے کسی کو تحفے میں بغیر دستے کی کٹار پکڑا دی جائے۔ تم تو کچھ اور چاہتی تھیں۔ ایک ساتھی۔ ایک رفیق۔

تم چپ ہو گئیں بس اپنے زرد چہرے کے ساتھ اپنا ہی گوشت کاٹ پھینکنے کے لئے چھری تیز کرتی رہیں ــــــ تم بچاری گیتا! چورا چوری کی خریداری کو چھپانے کے لئے گیہوں تہ خانے میں دبا کر بھوسے میں آگ لگا دینا چاہتی تھیں ــــــ تم اس فکر میں زرد اور دبلی ہوتی گئیں۔ مس ٹھاکر کا خیال تھا کہ تم میں اب جنسی بھوک جاگ اٹھی ہے۔ ان کا یہ خیال اس لئے زیادہ پختہ تھا کہ ان دنوں تم کیرتن میں شیام کی تلاش کے بجائے شیام سے شکوہ کرتی تھیں ــــ میں تو ہو گئی کالی کنہیا ــــــــــ

مس داس کا کہنا تھا کہ مس بوس نے کسی سے محبت کرنا شروع کر دی ہے کیونکہ اسے تمہارے چہرے پر اب وہ حسرت نظر آتی تھی جو عشق کے ماروں

کے لئے مخصوص ہے ـــــ مسز شرما کا کہنا تھا کہ تمہارے چہرے کی زردی تمہارے جگر کی خرابی کا نتیجہ ہے اور جینی ماما کو تمہاری چال ڈھال میں فرق محسوس کرنے کے بعد سے یقین ہو گیا تھا کہ تمہیں آتشک کی بیماری شروع ہو گئی ہے اور تمہارے کنبے کا متفقہ خیال تھا کہ تم اب اپنی ذمے داریوں کو کچھ زیادہ محسوس کرنے لگی ہو۔ سب کا اپنا اپنا خیال تھا مگر یہ سچ تھا کہ تمہیں اپنی ذمے داری کا احساس تھا۔ وہ ذمے داری جس کی بنیاد گویا پتھر اور سیمنٹ لگا کر خوب مضبوطی سے رکھی گئی تھی اور جو تم سے ہلائے نہ ہلی۔ نہ کڑوی کڑوی دوائیں اسے اپنے سیلاب میں بہا لے جا سکیں، نہ تیمارداری میں بھاری بھاری ٹینک اور پلنگ اٹھانے سے وہ بنیاد ڈگمگائی اور نہ بھگوان سے کی ہوئی دلدوز دعاؤں نے اسے ڈھایا۔ بس اندھیرے اندھیرے میں دھڑا دھڑ شاندار بلڈنگ بنتی چلی جا رہی تھی اور تم سے غریب گڑیا کی طرح اپنی جھونپڑی میں اپنے ان برتن سمیٹے نہ سمٹے ـــــ

آخر تم ناامید ہو گئیں۔ امید بے چینی ہے، اور ناامیدی سکون۔ تمہیں بھی سکون ہو گیا، کیونکہ تم نے ہار کر فیصلہ کر لیا تھا کہ تم تین مہینے کی چھٹی لے کر کہیں اور چلی جاؤ گی! ـــــ

گیتا! اے گیتا!!

مگر تم تو کہیں نہیں گئیں۔ تم تو اسی بستی کے زنانہ اسپتال میں ہو۔

جہاں تھیا سوفیکل کالج ہے ——— پرسوں ہی رات کو تو درد و کرب میں جانکسل
مبتلا ہو کر تمہیں یہاں آنا پڑا۔ کچھ ہی دن قبل تو آج کی تاریخ ہے تم نے تین مہینے
کی چھٹی منظور کروائی تھی ——— آج سے تمہاری چھٹی ہے مگر آج بھی
تم یہیں ہو۔ لیکن اس طرح جیسے کہیں نہیں ہو ——— سیتا دیر سے
سیاہ دری پر پڑی سو رہی ہے۔ مگر اس طرح جیسے شدتِ کرب میں
آنکھیں بند ہو گئی ہوں۔ اور تم سفید بستر پر ایسی منجمد پڑی ہو کہ ماضی
کی جلتی ہوئی کرنیں بھی تمہیں نہیں پگھلا سکیں۔

بستر پر انگڑائی لو گیتا، ہاتھ پاؤں ہلاؤ، اپنے لمبے لمبے بالوں کو دونوں
پہلوؤں سے سمیٹ کر سرہانے جھٹک دو اور اپنے بھرے بھرے سینے میں
اترتے ہوئے دودھ کی سرسراہٹ محسوس کر کے سسکیاں لو، آہیں بھرو، کیونکہ
تمہارے سینے کی اس فطری تکلیف کو ہلکا کرنے والا تمہارے پہلو میں نہیں
بلکہ ہاسپٹل کی حدود سے بہت دور بستی کی ایک عالی شان کوٹھی میں بیگم غفار
کی سوکھی چھاتی منہ میں لئے چچوڑ رہا ہے اور انہیں یقین ہے کہ ان کے سینے
سے ممتا کے سوتے دودھ کی شکل میں پھوٹ پڑیں گے ——— افوہ
گیتا، اور تمہارا سینہ ہاسپٹل کے بستر پر پڑے پڑے پھٹا جا رہا ہے۔ ایسا
لگتا ہے کہ ذرا سی دیر میں دودھ سے بھرا ہوا تمہارا سینہ جوالا مکھی
کے دہانوں کی طرح پھٹ پڑے گا اور دودھ ہی دودھ بہنے لگے گا تمہارے

بستر پر، سامنے ہاسپٹل میں، اس عالی شان کوٹھی میں جہاں ایک ایسا بچہ ایک سوکھی چھاتی چچوڑ رہا ہے جو مقررہ میعاد سے دو مہینے قبل ہی اس دھرتی پر آ کر رونے لگا۔ ہر جگہ دودھ ہی دودھ بہنے لگے گا۔ یہاں تک کہ چیز دودھ میں ڈوب جائے گی، وہ پتھر بھی جو آج سورج ڈوبنے سے قبل دو مذہب والوں نے ایک دوسرے پر پھینکے، وہ چھرے بھی جو انسانوں کے پیٹوں اور سینوں میں ڈوب کر ابھرے، وہ خون بھی جو سڑکوں پر جما پڑا ہے اور فساد کی وہ آگ بھی جو ہندو کا بچہ، مسلمان کی گود میں جلنے کی وجہ سے بھڑکائی گئی تھی ـــــ وہ شرم بھی جو تمہارے سینے کو کھائے جا رہی تھی۔ غرض ہر چیز دودھ کے سیلاب میں غرق ہو جائے گی، ممتا میں ڈھل کر پاک ہو جائے گی۔ دودھ جسے ممتا جنم دیتی ہے، وہ ممتا جس کے اظہار کی تم نے سماج سے اجازت نہیں لی ـــــ مگر جب تم ہی یہ سب چاہو جب ہی نا۔ تم تو ایسی ٹھنڈی نظر آ رہی ہو جیسے کسی بنگالی قحط زدہ کے گھر کا چولھا۔ وہ ٹھنڈا چولھا جسے گرم کرنے کے لئے قحط کے دنوں میں بنگال سے اتنی دور رہ کر تم نے کئی سو روپیہ چندہ اکٹھا کیا تھا اور اپنی وہ اکلوتی بنارسی ساری جو تمہیں بہت عزیز تھی تم نے چندے میں شامل کر کے کلکتے کی ایک ریلیف کمیٹی کو بھیجی تھی۔ کیونکہ بنگال تمہیں بہت پیارا تھا، وہاں کی تہذیب، وہاں کا ادب، وہاں کے نغمے

وہاں کا رقص، وہاں کا رنگ، غرض تمہیں بنگال کی ایک ایک چیز سے محبت تھی، یہاں تک کہ تمہارے جاننے والے تمہیں صوبائی تعصب میں مبتلا سمجھتے تھے ـــــ مگر اس وقت تو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے تمہیں بنگال کی کسی چیز سے عشق نہیں، سوائے ٹھنڈے چولھے کے ـــــ کیا تم بنگال سے انتقام لے رہی ہو کہ وہ تمہیں اپنے وسیع دامن میں سے ایک ساتھی نہ دے سکا؟

گیتا! اے گیتا!!

بستی میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ گیہوں کے ساتھ لگ آنے والا بھوسہ ہر جگہ اڑ رہا ہے۔ لوگوں کی زبان پر تمہارا نام ہے۔ زندہ دل تم پر ہنس رہے ہیں۔ اور دنو تمہیں گالیاں دے رہے ہیں۔ کالج کے کرتا دھرتا قسم کے لوگوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ تم سے فوراً استعفیٰ طلب کریں گے۔ گندہ انڈا یوں سامنے رکھا ہے تو کچھ نہیں، پر جب وہ پھوٹ جائے تو دیکھنے والے کی طبیعت خواہ مخواہ بری ہونے لگتی ہے اور آج شام کو بستی کے کچھ ذمے دار لوگ سرکاری عہدے داروں کے حضور میں سڑکوں پر پڑا ہوا خون نالشنے (؟) پھالنگتے، ایک وفد کی صورت میں پہنچے ہیں کہ حضور ہندو کی چیدا چوری کی لذت کا شکر کسی مسلمان کو پالنے کے لئے دے دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دس کروڑ مسلمانوں میں ایک کا اضافہ

ہوگیا، اور اب ہندو یہ نہیں برداشت کرسکتے، کیونکہ برسوں اکٹھا رہنے والی دو قوموں کے درمیان اگر کوئی رشتہ رہ گیا ہے تو وہ اکثریت اور اقلیت کی کشمکش ہے —— سیاست کے اس عروج کو اسپتال والوں نے نظر انداز کر دیا اس لئے اتنی گڑبڑ ہوگئی۔ ورنہ حضور! ——

گیتا! تمہیں بستی بھر کے سامنے برہنہ کر کے ہندو مسلم منافرت کا ثبوت گوری چمڑی والوں کو دے دیا گیا۔ دیش بھگت لالہ سادھومل کا مقصد پورا ہوگیا، ایک تیر میں دو شکار بیندھ گئے۔ لالہ جی جنہیں تم نے ایک دن کیرتن میں کسی بات پر ڈپٹ دیا تھا۔

گیتا! اے گیتا!!

دیکھو رات کتنی منحوس آہستگی سے گذر رہی ہے۔ جیسے یہ رات اپنے کندھے پر ساری دنیا کے مردہ ضمیر کا جنازہ اٹھائے ہو —— اور چاند بور سے لدے ہوئے آم کے درختوں کے اوپر لٹک کر رہ گیا ہے، زرد اور اداس چاند۔ ستاروں کی چمک بجھتی سی جا رہی ہے۔ اور ہوا میں دبی دبی سی جھنکار ہے، جیسے مرگھٹ میں چڑیلیں ناچ رہی ہوں۔ خوشیاں منا رہی ہوں اور سنو وہ کوئی نوزائیدہ بچہ بلی کی سی منحوس آواز میں رو رہا ہے۔ کیسی منحوس ہوتی جا رہی ہے رات؟ —— میں تمہارے سرہانے کھڑی منہ بسور رہی ہوں۔ اور تم روٹھے ہوئے جابر خاوند کی طرح اپنے آپ میں مست

پڑی ہو، لیکن گیتا رانی کوئی اپنی زندگی سے بھی روٹھ جاتا ہے۔ زندگی سے روٹھنا تو بزدلی ہے، فرار ہے۔ سب تم پر ہنس رہے ہیں، تمہارا مذاق اُڑا رہے ہیں بھگوان داس ہنس رہا ہے، شیام قہقہے لگا رہا ہے۔ شرافت اور مذہب خندہ زن ہے، سیاست اور دیش بھگتی ٹھٹھے لگا رہی ہے ــــ اور تھیاسوفیکل کالج کے ہال میں رکھی ہوئی بھگوان کی مورتی تو بنی ہی ہے ہنسنے کے لئے مگر تم نہ ہنستی ہو نہ روتی ہو ـــــــ تم بھی ہنسنے لگو، قہقہے لگاؤ۔ اور مجھے پیار سے لپٹا کر قہقہے لگاتی باہر نکلو ـــــ پھر سب خاموش ہو جائیں گے۔ ہنسی کا ہر منحوس غلیظ سوتا سوکھ جائیگا۔ بس تمہاری ہی ہنسی رہ جائے گی۔ زندہ اور پاکیزہ سچائی سے لبریز ہنسی۔

گیتا! اے گیتا!!

مجھے لپٹا لو۔ اپنے سینے سے بھینچ لو، سنو! سنو! ہوا میں کیسی پھڑپھڑاہٹ ہے، جیسے بھاری دامن اُڑ رہا ہو، فضائیں کس کے بھاری قدموں کی دھمک ہے ـــــ دیکھو، ہر طرف سے اندھیرا امنڈ رہا ہے، موت کے سیاہ دامن کا سایہ ـــــ یرقان زدہ چاند، تاریک ہو رہا ہے، تارے کھو رہے ہیں۔ اٹھو گیتا!

اے گیتا!

———

چوری چھپے

"بلّی ! اری بلّی !"

ادھر اس کی اماں اسے پکار رہی تھیں، اُدھر دینو اس کا ہاتھ نہیں چھوڑتا تھا، اور بلّی عجیب کشمکش میں تھی۔

"چھوڑو بھئی ای ——— اوں" وہ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے ٹھنکی۔

"نہیں بلّی۔ پہلے لاؤ ——— تب چھوڑیں گے" دینو کے بڑے سے کھردرے ہاتھ کی گرفت سخت ہو گئی۔ اور بلّی کی نازک کلائی جیسے چٹخنے لگی۔ دینو کی آنکھوں میں بھک منگوں جیسی بات تھی۔ بلّی پسیج رہی تھی ——— مگر بھئی یہ کون سا موقع تھا۔ اسی کو تو دلدل میں چہل قدمی کہتے ہیں۔ دینو

تو بعض وقت ایسا ننھا بن جاتا جیسے کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ رتی رتی حال جانتا تھا گھر کا اس پر بھی آنکھوں پر ٹھیکری رکھ کر گھگھیائے جاتا ہے ۔ "نہیں پہلے لا کے دو۔"

"ابھی نہیں ۔ ذرا دیر بعد، جب سب سو جائیں گے ۔ نہیں تو کوئی دیکھ لے گا اور پھر آفت آجائے گی ۔ ہاں۔" بلّی نے خوف سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سرگوشی کی ۔" چھوڑ دو۔ اماں پکار رہی ہیں۔" جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا تو کانچ کی چوڑی چٹ سے ٹوٹ گئی ۔ وینو سہم گیا ۔ لیکن بلّی ایک لمحے کی دیر کئے بغیر تتلی کی طرح اندر کی طرف اُڑ گئی ـــــ اس کی کلائی کسک رہی تھی اور پورا جسم دھڑکن بنا ہوا تھا۔

آنگن میں قدم رکھتے ہی وہ بیر بہوٹی کی طرح دبک گئی، کیونکہ سامنے ہی باورچی خانے میں امّاں کچھ اٹھا دھری کر رہی تھیں ـــــ بلّی نے چاہا کہ ان کی نظر بچا کر کمرے میں کھسک جائے ۔ اسے معلوم تھا کہ ان دنوں گھر میں سب اس سے کھٹکے ہوئے ہیں ۔ لگاوٹ بھی کہیں چھپتی ہے؟ جامن چاہے کہیں بھی چھپا کر کھائی جائے، کمبخت منہ کی اور راہٹ چغلی کھا دیتی ہے ـــــ ان دنوں بس جہاں وہ ذرا اِدھر اُدھر ہوئی کوئی نہ کوئی کلیجہ پھاڑ کر اُسے پکارنا شروع کر دیتا ۔ خصوصاً دادی ـــــ پچھلے ہی دنوں گھر میں مرغی کے بچے نکلے تھے، رنگ برنگی روئی کے گالے جیسے

بچے۔ وہ ذرا بھی مرغی سے الگ ہو کر چگنے لگتے تو مرغی پر پھیلا کر اور کڑ کڑ کر کے سب کو اکٹھا کر لیتی اور پھر اپنے کالے کالے سخت پروں کے نیچے ڈھانپ کر بیٹھ جاتی انڈے سینے سے جی نہیں بھرا تھا جو اب بچے بھی سینے پر تلی رہتی۔ اور بلی کا دم الجھتا بے چارے بچوں کے لئے ـــــ کیونکہ دادی بھی تو چاہتیں کہ تینوں لڑکیاں، خصوصیت سے بلی بیٹھی، آٹھوں پہر انہی کی صورت تکا کرے۔ اور بلی کو یہ بات بڑی نامعقول لگتی۔ مگر اب تو بلی کی بو باس پاکر، سارا گھر اس کے لئے دادی بنا ہوا تھا۔ حد یہ کہ اس کی اماں جیسی لاپروا بھی اس سے چوکنی رہتیں ـــــ بلی نے چند لمحے رک کر اماں کو دیکھا اور پھر چپل تلووں سے چپکائے وہ بغیر کسی آواز کے کمرے کی طرف لپکی کہ جا کر چپکے سے لیٹ رہے تاکہ سوال وجواب کی نوبت ہی نہ آئے۔ مگر ـــــ

"کہاں تھی تو بلی؟ اور یہ حلیہ کیا بنا رکھی ہے" اماں کی کرخت آواز نے جیسے پیچھے سے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں، ـــــ وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ اس کی اوڑھنی ایڑی پر لوٹ رہی تھی۔ اور بال ماتھے پر۔

"یہیں تو تھے ہم" بلی منہ پھلا کر صاف جھوٹ بول گئی۔ مگر اس کی کلائی نے کسک کر جیسے اس کی چغلی لے لی۔

"جا اندر سو۔ لو دھوپ میں بھی قرار نہیں، کمبخت جلے پاؤں کی بلی کو"۔

اماں نے شک و شبہ سے بھری ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے حکم لگایا۔ اور بلی اوڑھنی میں لپٹی جلدی سے کمرے میں گھس گئی ——— اماں کی نظریں؟ توبہ! سوچنا للتیں اسے تو۔ مگر کمرہ بھی کون سا غسلخانہ تھا اس کے لئے ——— آسمان سے ٹپکی تو کھجور میں اٹکی۔ دادی سو نہیں رہی تھیں بلکہ کھرّے بھیگے پلنگ پر بیٹھی مٹھو بیٹے کو پنجرے میں نہلا رہی تھیں، اور مٹھو بیٹے تھے کہ پر پھٹپھٹا کر بیوی! بیوی! کی رٹ لگائے ہوئے تھے۔ بلّی نے دروازہ بھیڑتے ہوئے کنکھیوں سے دیکھ لیا کہ دادی کچھ تنی تنی سی توجہ اس کی طرف دے رہی ہیں۔ ان کا منہ خالی تھیلے کی طرح لٹکا ہوا تھا اور نظریں ٹیڑھی ٹیڑھی کیا مصیبت ہے۔ وہ ڈری کہ کہیں اب دادی باضابطہ تفتیش نہ شروع کر دیں۔ سامنے ہی نمّو کی چارپائی پڑی۔ بس وہ جھٹ بڑی مسکینی سے نمّو ہی کے پاس ڈھیر ہو گئی، گویا اس کا مارے نیند کے دم نکل رہا ہو وہ جانتی تھی کہ دادی کی خوشنودی حاصل کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے دوپہر بھر پاؤں پھیلا کر سو یا جائے۔ وہ شاید ذرا ہی دیر میں خراٹوں کا پروگرام بھی شروع کر دیتی، مگر نمّو ایسا کمینہ کہ فوراً اترانے لگا۔

"مٹھو ہمارے پاس سے" نمّو نے کروٹ لے کر اس کی کمر میں ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ "ایک تو ویسے ہی گرمی ہے اور یہ کہ آگئیں بھنبھناتا ہوا

بدن؟" بلّی کے کان میں نمّو کی جلتی ہوئی سانس کنکھجورے کی طرح گھُس گئی۔ لیکن وہ سہمی پڑی رہی، گویا گہری نیند میں ہو۔ مگر پھر بھی قرار کہاں؟

"سنتی نہیں لاٹ صاحب؟ ہٹو نہیں تو ہم شکایت کر دیں گے کہ اس دن تم ددّو کو ـــــ ہاں نہیں تو" اب کے نمّو نے منمنا کر اس کی دکھتی رگ کھسوٹ لی اور بلّی کو لگا کہ وہ گرم پانی سے بھرے ہوئے ٹب میں چھپاک سے جا گری ہے مارے غصّے کے بلّی کے جی میں آئی کہ اٹھ کر نمّو کے ایسا تھپڑ جڑے کہ اس کا منہ پھر جائے۔ مگر نمّو کچھ اور بھی بک دے تو؟ اس کی زبان پر کونسی مُہر لگی ہے؟ بلّی اس ڈر کے مارے چپ چاپ مار کھائی ہوئی کتیا کی طرح آپا کے پلنگ کی طرف بڑھی۔ دادی بے تعلق سی بیٹھی تھیں، جیسے انہوں نے نمّو کی کمینگی دیکھی ہی نہ ہو۔ بلّی کا جی چاہ رہا تھا کہ جانے کیا کچھ دانتوں سے کتر کر پھینک دے۔ مگر جب ہر طرف طعنوں کے یہ لمبے لمبے کوڑے اٹھتے ہوں تو اکیلی بے چاری سر نہ جھکائے تو کیا کرے۔ لو اب یہ آپا پلنگ کے بیچوں بیچ لاش کی طرح پڑی ہے جیسے ابھی ابھی بے خبر سو گئی ہو۔ بلّی کے غصّے کی بارود تلے جوتے آنسوؤں میں سیل گئی اس کا جی چاہا کہ بس آتشبازی کے دھماکے کی طرح پھٹ کر خود بھی ختم ہو جائے، چھٹی ہو جائے سب کو اس سے۔ دیکھو کیسی پلنگ پہ چپ چاپ پکر

لیٹی ہوئی ہے یہ آپا کمبخت۔

"بیوی! بیوی!" زمین پر رکھے ہوئے پنجرے میں مٹھو میٹے، بلّی کی گھٹی ہوئی روح کی طرح پھڑپھڑائے اور دادی نے پنکھا سنبھال کر لیٹے ہوئے زور سے کھنکارا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ ہوں! ہم خوب سمجھ رہے ہیں۔ بلّی جلدی سے آپا ہی کے پلنگ کی پٹی پر سمٹ کر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اب جا کر کہیں اس کا دل قابو میں آیا۔ توبہ! کیسے کیسے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں چوری کے معاملات میں۔ کیسے کیسے کڑوے گھونٹ چپکے سے پی جانے پڑتے ہیں۔ ورنہ اس وقت تو وہ ممّو کو مزا چکھا دیتی کمر میں ٹھوکا دینے کا۔ پھر چاہے دادی بکھرتیں اپنے لاڈلے کے لئے یا امّاں اسے پھٹکار دیتیں۔ پر وہ اپنی سی تو کر ہی لیتی۔ اور یہ آپا کمبخت تو پوری گھُنّی ہے ذرا اس پر پیٹھ ٹکائی اور اس نے دیا جھٹکا۔ ویسے تو بڑی ہمدردی دکھاتی ہے، مگر موقع ملے تو چوکتی نہیں۔ خواہ مخواہ کا رعب گانٹھنے لگتی ہے۔ خود جو جی میں آئے کرتی ہے، مگر بلّی کو نصیحتوں کی پوٹلیاں باندھ باندھ کر دیتی ہے۔ آخر وہ بلّی سے کون سی ایسی بڑی ہے، یہی کوئی ڈیڑھ دو سال کی چھٹائی بڑائی ہے۔ اور یہ ممّو ادھر نارا، اس کی چھوٹی بہنیں نہیں بیرنیں ہیں بیرنیں۔ بلّی سب کی حرکتیں دیکھتی مگر کیا مجال جو منہ سے نکال جائے۔ بس سب کی باتیں گٹر کی طرح اپنے اندر ڈال لیتی۔ مگر یہ لوگ ایسے

کہ اس دن ذرا دنبو کو دیا سلائی کی ڈبیا دیتے دیکھ لیا تو جھٹ آ کر اماں سے
شکایت جڑ دی کہ بلی تو روز دیا سلائی کی ڈبیاں چرا چرا کر دنبو کو دیتی ہے
اس پر اماں نے بے چارے دنبو کو برا بھلا کہنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی
اور بلی کا دل دن بھر ڈوبا ڈوبا سا رہا۔ اس پر طعنے ملے سو گھاتے ہیں کہ یہ
ہے بیچاری بلی کو تو یا متا ہے دنبو کی۔ چاہتی ہے کہ سب کچھ لٹا دے اس پر۔ مگر
مجھو! لاکھ کوئی طعنے دے، لاکھ پابندیاں لگا دے۔ پھوٹے سوتے بہنے
سے کبھی رکے ہیں۔ بلی کو یقین تھا کہ دنیا میں صرف دنبو ہی اسے پیار
کرتا ہے، دنبو ہی اس کی روح میں جھانک سکتا ہے۔ بس۔ سب بھائی
بہنوں میں بدصورت اور مخمس تو بلا کی تھی، اس لئے گھر میں ماند سی
رہی۔ خاندان کے جانے کتنے صنو بھائی، متنے بھائی اور جانے کتنی آپائیں
گھر میں آتی جاتی رہتیں۔ آپا کی آنکھیں کیا تھیں، ڈگڈگی تھیں کہ سب بندر کی
طرح اس کے گرد ناچتے۔ تارا اپنے گھنگریلے بالوں اور شوخ باتوں میں
الجھا ہی لیتی ذرا دیر کو، اور نجو تو بس خوش رنگ غبارہ تھی۔ سبھی اسے پکڑنے
کو لپکتے۔ نمو الگ بڑا استاد تھا۔ اسے جانے کتنے گانے یاد تھے، اس
پر نخرہ ایسا کہ سب خوشامد کرتے کہ نمو سنا تو دے وہ سا گانا، اور نمو گھنٹوں
اترانے کے بعد کسی کی سنتا۔ اب اتنی بہت سی دلچسپیوں کے بعد کون موئی
سی بلی کی طرف متوجہ ہوتا۔ اور بلی بھونرے کی طرح بھٹکتی سب

کچھ ٹکر ٹکر دیکھا کرتی۔ سورج نکلتا، گھر بھر میں دھوپ پھیلتی، لیکن دالان اور دالان کے پہلو میں چھپی ہوئی کوٹھڑی میں دھوپ کی گرمی تک نہ پہنچتی۔ یونہی مارے سیلن کے کوٹھڑی چپ چپاتی رہتی۔ یہی حال للّی کا تھا۔ بیچاری پیدا ہی دائم المرض ہوئی تھی۔ سوکھی سہمی اور روتی۔ اس لئے جب ذرا سی بچّی تھی تو بھی کوئی اسے پیار سے گود میں نہ لیتا۔ بس بجلی چھپکلی کی طرح پلنگ پہ پڑی رہتی۔ اماں اس کے پوتڑے بدلتے بدلتے تنگ تھیں اور وہ روتے روتے۔ گھر میں پھل آتے، مٹھائیاں آتیں، سب کھاتے پیتے، بچے سے بوڑھے تک۔ اس نے جو ہمک کر ہاتھ بڑھایا تو چیز ہاتھ سے چھین جاتی: "مرے گی نگوڑی کھا کر، دیکھو پیٹ نقارہ ہو رہا ہے اور سارا بدن دانوں سے لدا ہوا ہے" تو کسی۔ کسی نے اٹھا کر الگ بٹھا دیا، اور وہ پھڑک پھڑک کر رونے لگتی۔ یا پھر مٹی کے دھوندے کی طرح بیٹھی ٹر ٹر سب کو تکا کرتی، غرض بیچاری للّی کو آنکھ کھولتے ہی اپنی کمتری اور محرومی کا احساس ہو گیا، اور بڑھتے بڑھتے یقین لیکن جب سے دینو گھر میں آیا تھا، اس نے للّی کی روح پر سے کمتری کا زنگ جیسے کھرچ دیا تھا ——— وہ آیا، بجّو اور نارا کو تو سخت ناپسند کرتا، وہ کہتا بس گھر بھر میں ایک للّی ہی تو ہے جو رانی ہے رانی ———
اور یہ معلوم کر کے للّی کا کلیجہ ہاتھ بھر کا ہو جاتا، اور اسے دینو کے بغیر دنیا سونی

لگتی، آپا منہ سکیڑ کر کہتی، توبہ دینو ہے کیا، ہنھ! مگر آپا کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ تین فاقوں پہ سؤر بھی جائز ہے ـــــ بلّی تو دینو ہی میں مگن تھی مگر وہ تھی پیدائشی بدنصیب۔ گھر میں سبھی کو دینو کھٹکنے لگا۔ دینو تو ایسا ہے۔ دینو تو ویسا ہے۔ تو بس دینو کا گھر میں آنا جانا بند کر دیا گیا، وہ ڈیوڑھی میں پڑا رہتا، اور بلّی کو گھر پنجرہ لگتا۔ دینو نے بلّی کو بتایا تھا کہ وہ تو بلّی کی وجہ سے یہ ذلت برداشت کر رہا ہے، ورنہ کب کا منہ کالا کر جاتا کہیں۔ اور بلّی کا جی چاہتا کہ نچھاور ہو جائے دینو پر سے۔ یہ ٹھیک بھی تھا۔ گیند جتنے پہ پڑے گی تو اچھلے گی ضرور ـــــــــ بلّی دینو کے قریب ہونے کے لئے کیسے کیسے الٹ پھیر کرتی، پنجرے کی سلاخوں کو کتنے دھکے دیتی نئے نئے چور دروازے ڈھونڈ لیتی اور سب کی نگرانیاں دھری کی دھری رہ جاتیں۔ سیلی ہوئی اندھیری کوٹھری میں دینو نے روشندان جو پھوڑ لیا تھا ـــــــ اور اس لئے اس وقت بھی بلّی کو اپنا وعدہ پورا کرنے کی پڑی تھی۔ اس نے آنکھیں ذرا سی کھول کر نیم تاریک کمرے کا جائزہ لیا۔ ممّو نکر چڑھائے ننگے بدن پڑا سو رہا تھا۔ بجیّو کا ڈنک ساکت تھا۔ نجو اور تارا ایک پلنگ پر ایک دوسرے سے ملی ملی لیٹی ہوئی تھیں۔ پسینے میں تر بتر گہری نیند میں ڈوبے ہوئے ننھے سو رہے تھے۔ دادی پنکھا جھلتے جھلتے اب اپنے چند دانتوں والے پچکے

ہوئے منہ سے پھک پھک لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھیں اور میاں مٹھو پر دل میں منہ چھپائے ہوئے تھے۔ بلّی نے گردن موڑ کر آپا کی طرف دیکھا وہ بھی بدستور پلنگ پر چھائی، آنچل منہ پر ڈالے سو رہی تھیں۔ ذرا دیر رُک کر بلّی بہت آہستگی سے اٹھی۔ لیکن کمبخت پلنگ کی چول چر سے بول اٹھی اور بلّی کا کلیجہ اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔ اس کی نظر آپا پر جم گئی۔ مگر آپا ویسے ہی لاش کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر سب کو دیکھا سب سو رہے تھے۔ وہ ننگے پاؤں چل کر دادی کے پائنتی رکی اور دادی کی طرف سے خوب اطمینان کر کے چپکے سے ادوائن پر رکھا ہوا پاندان اٹھا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ ہولے ہولے، جیسے کوئی مردے کے منہ پر سے کفن سرکائے، پاندان کھولا اور پان بنانے لگی۔ ڈلی تو دادی کے پاندان میں خوب باریک کٹی ہوئی رہتی ہی۔ بس جھپ سے ایک بڑی سی گلوری، الائچی ڈال کر بنائی اور احتیاط سے پاندان جہاں کا تہاں رکھا ہی تھا کہ مٹھو میٹے نے پر پھڑ پھڑا کر ٹیں کی۔ بلّی لپک کر پانی کی صراحی کے نزدیک بیٹھ گئی۔ دل بلّیوں اچھل رہا تھا اور نبد مٹھی میں گلوری جیسے دھڑک رہی تھی۔ لیکن دادی بدستور خراٹے لے رہی تھیں، نمو اسی طرح نکمر چڑھائے پڑا تھا اور ننھو اور تارا ویسے ہی گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ بس آپا نے شاید اپنی ٹانگ ہلائی تھی، مگر بلّی نے خیال کیا کہ یہ بھی اس کا

وہم ہے۔ دل میں ڈر ہو اور جگہ اندھیرے میں ڈوبی ہو تو ہر طرف بھوت نظر آتے ہیں۔ بلّی اپنی سانسیں روکے، قدم تولتی دروازے کی طرف بڑھی۔ دینو اس کا انتظار کر رہا ہوگا، بے چارے کا منہ پنھیا رہا ہوگا دینو اسے دیکھ کر کتنا خوش ہوگا۔ وہ اسے اپنے ہاتھ سے گلوری کھلائے گی اور دینو ——— تصوّر ہی سے بلّی کا دل خوشی سے ناچنے لگا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھولا، اس کے منہ پر لو کا ایک تھپڑ سا پڑا۔ اور تیز دھوپ میں آنکھیں مچمچا گئیں اس نے گردن نکال کر ملے ہوئے کمرے کو دیکھا جہاں اس کی امّاں اور آپا دوپہر کو سوتے تھے۔ وہ دروازہ بھی بند تھا ——— اس نے ایک بار پھر مڑ کر اندر دیکھنا چاہا مگر اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ وہ جلتی زمین پر ننگے پاؤں ہی بھاگی ڈیوڑھی کی طرف ———

" بیوی! بیوی!" مٹھو میاں نے رٹ لگا دی کمرے میں۔ بلّی وہاں ہوتی تو اس کی گردن مروڑ دیتی، مگر وہ تو ان آوازوں سے دور تھی۔ محبت اور مسرت کی پھیلی ہوئی باہوں کے قریب۔

دینو دیوار سے پیٹھ لگائے اونگھ رہا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں بعض لوگوں کے لئے افیون کا کام دیتی ہیں۔

" دینو!" بلّی نے پکارا اور دینو نے جھٹ اٹھ کر بلّی کو یوں ہاتھوں ہاتھ اٹھا

لیا جیسے بلّی بیلے کے پھولوں کا ہلکا سا ہار ہو۔ بلّی کو چکّر سا آگیا۔ اُس کی مٹھی میں گلوری دھڑک رہی تھی اور گلے میں آنسوؤں کے پھندے سے پڑ رہے تھے۔

—— کتنی مشکل سے تو وہ یہاں آسکی تھی اس وقت، کیسے کیسے خطروں اور خوف سے اپنی جھولی بھرے ہوئے۔ اُف یہ چوری کی راہ چلنا تو تلوار کی دھار پر ننگے پاؤں چلنے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ بلّی نے اپنا جلتا ہوا چہرہ دینو کے سینے پر رکھ دیا۔ پسینے سے بھیگے ہوئے ننگے سینے پر ——

"بلّی، میری رانی بلّی۔ اب لاؤ بھی" دینو نے اسے لپٹاتے ہوئے کہا اور بلّی نے مسکرا کر اپنا سر پیچھے جھکاتے ہوئے گلوری دینو کے منہ میں ٹھونس دینا چاہی لیکن اچانک جیسے بلّی کی آنکھوں کے سامنے ڈیوڑھی ناچ گئی، اور دماغ میں دھائیں دھائیں ہونے لگی۔ کیونکہ دادی کے نیچے کھچے جھولتے ہوئے دانت ڈیوڑھی میں اژدھے کے دانتوں کی طرح بھیانک لگ رہے تھے اور ان کے پیچھے آپا بھی تو تھی۔ زلزلہ سا آگیا اور اسی زلزلے میں بلّی زمین پر آرہی۔

"چھو کُتیا! بے کہے پن کی حد کر دی" دادی نے بلّی کا نرم کان جیسے اکھاڑ لینے کی ٹھان لی اور بلّی بل کھا گئی، گلوری اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔

"یہ ـــــ پان بنا بنا کر دیئے جاتے ہیں" دادی نے گلوری اپنے سلیپر تلے روند کر کہا: "اور تو دینو ـــــ" بی کا کان لگام کی طرح کھینچے ہوئے وہ دینو کی طرف متوجہ ہوئیں "شرم نہیں آتی۔ دیکھ ابھی بی کے ابا سے کیسے جوتے لگواتی ہوں۔ نگوڑے میں تو تجھے پہلے ہی دن سے جان گئی تھی کہ تیرا ہاتھ صاف ہے اسی لئے میں نے تجھے مروانے کے کام پر لگوایا۔ اب تو نے لونڈیا کو سکھا پڑھا لیا کہ گھر ہی سے تیرا پورا ہوتا رہے نمک حرام کمینے! کیا تجھے تنخواہ نہیں ملتی؟" دادی بڑے انہماک سے گرج رہی تھیں۔ ابا دوپٹے کا کونا دانتوں میں دبائے آنکھیں مٹکا رہی تھی اور بی کا کان جیسے اکھڑا جا رہا تھا۔

"بڑی بیگم۔ بڑی بیگم! خدا معاف کرو میری۔ یہ سسری پان بیڑی کی طلب بری ہوتی ہے حضور تنخواہ میں بال بچوں کا بھی پورا نہیں پڑتا آپ ہی مائی باپ ہیں سرکار" بی دیکھ رہی تھی کہ خوشامد کی جھکالی میں دینو کی سفید چھوٹی داڑھی بکرے کی داڑھی سے خاصی مشابہ ہے اور اس کا جھریوں سے پٹا ہوا سیاہ جسم بکرے تھرا رہا ہے۔

"چل چپ رہ نگوڑے، ہم نے تیرے بال بچوں کا ٹھیکہ لیا ہے؟" دادی نے بی کا کان گھسیٹا اور اندر کو چلیں۔ بی نے جاتے جاتے مڑ کر آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا کہ دینو اس کے اکھڑتے ہوئے کان کا سوگ منانے کی بجائے جوتی تلے روندی ہوئی گلوری اٹھا کر منہ میں رکھ رہا ہے۔ بی کے کلیجے پر

وہ روندی ہوئی گلوری جیسے بھاری سل کی طرح دھڑ سے آ گری ـــــ
آنگن تک وہ سکتے میں چلی آئی، مگر جب اس نے دیکھا کہ آپا اپنی ڈگڈگی بلا
رہی ہے اور دادی اُس کا کان پکڑے کمرے کی طرف گھسیٹ رہی ہیں
اور نمو سنجو اور تارا کے ساتھ کمرے کے دروازے میں کھڑا آنکھیں میچا کر
تماشہ دیکھ رہا ہے تو بلّی کا جی چاہا کہ آتشبازی کے دھماکے کی طرح سپٹ کر ختم
ہو جائے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ تو وہ جلتی زمین پر اچانک مچل کر زور زور
سے رونے لگی۔

دادی ماتھا ٹھونک کر کہہ رہی تھیں۔

"اوئی بیوی۔ یہ آٹھ برس کی لونڈی اور یہ دو سال کے بچّوں جیسی
حرکتیں ـــــ ہائے سنجو اور تارا تو اس سے چھوٹی ہیں مگر کیا مجال جو گھر سے
کوئی چیز اٹھا کر کسی کو باہر دے دیں۔ مگر یہ نوالی نّنو تو گھر لٹانے پر تلی
ہوئی ہیں۔ اور جو منع کرو تو ہائے بیتیا ـــــ ابھی ان کی اماں
اٹھیں گی تو کہیں گی کہ بڑھیا نے بچی کو مارا ہوگا ـــــ
ـــــ لو بیوی میری توبہ ـــــ!"

لاعلاج

کزبن نے جالے سے بھری ہوئی سفید آنکھوں سے بہتا ہوا پانی پونچھا اور پھر ٹکٹکی لگا کر ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھنے کی کوشش کرنے لگی وہ دونوں جو چند ہی گز کے فاصلے سے اسے دھندلے نظر آنے لگے تھے اب بھنگیوں کی جھونپڑیوں کی پہلو والی پگڈنڈی پر پہنچ کر اسے دو دھبّے سے نظر آ رہے تھے۔ ایک سرخ دھبّہ جو لنگڑاتی ہوئی گھوڑی پر سوار تھا اور دوسرا سفید دھبّہ جو گھوڑی کے ساتھ ساتھ تھا۔ بین کر کر کے رونے کی آواز اب اس کے کانوں میں بہت مدھم سی آ رہی تھی' اے موری میّا! دیّا —— جیسے کہیں قریب ہی مچھر گا رہے ہوں پھر وہ آواز بھی ختم ہو گئی اور چند منٹ بعد وہ دھبّے بھی اس کی

نظروں سے غائب ہو گئے ــــــ مگر پھر بھی اس کی گھنا ؤنی آنکھیں ادھر سے نہ ہٹیں، وہ اسی طرح ٹکٹکی لگائے رہی۔ آنکھوں سے سفید گولا پانی بہ بہ کر چہرے کی چنٹ دار جلد میں اپنے لئے راستے منتخب کرتا رہا، اور روئی کے بیلے کنٹوپ سے منڈھا ہوا سر کل کے گڈے کی طرح ہلتا رہا۔ اس کا پوپلا منہ آہستہ آہستہ اس طرح چل رہا تھا جیسے وہ کوئی چیز چبا رہی ہو جس کی وجہ سے جھریوں سے بھری ٹھوڑی اور ہونٹوں پر لٹکی ہوئی کھٹائی جیسی ناک، ایک دوسرے کو چھونے کے لئے پینترے بدل بدل کر بڑھتی معلوم ہوتی تھیں ــــــ لیکن وہ تو بس ٹکٹکی لگائے کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی مگر پھر بھی دیکھ رہی تھی۔

"اری لائی! اللہ میاں کا شکر کر اور دعا کر اس نے لونڈیا کو ٹھکانے لگایا ہے تو راجی کھوسی بھی رائیے۔ اب دیکھت کاہے مائی؟" کرمین سے ذرا ہٹ کر لہنگے پھیلائے بیٹھی ہوئی بھنگنوں میں سے ایک نے اس سے کہا۔ اور کرمین نے اپنے جی میں کہا "ٹھیک تو کہتی ہے مدنا کی بہو ــــــ مگر ــــــ" اس کی نظر ادھر سے ہٹائے نہ ہٹی۔

"گھر سونا لگن لاگا" دوسری بھنگن نے ایک آہ بھر کر کہا تو کرمین چونک کر پیچھے مڑی اور چہرے سے لیکر ٹھوڑی تک جیسے اس بات کی صداقت جا نچنے لگی۔ اسے ایسا لگا جیسے اس گھر میں ایسی آگ لگ گیا ابھی تک بجی ہے، جس

نے ایک ایک شے، پیاری سے پیاری اور بیکار سے بیکار، جلا کر خاک سیاہ کر دی اور اب وہ تن تنہا، سیاہ خاک کے اس ڈھیر کے پاس بیٹھی ہے ——— اس کا جی کچھ ایسا ہونے لگا جیسے کوئی اسے اندر ہی اندر مٹے لے لے کر مل رہا ہو۔

"یہ لڑکی تو پیا یا دشمن ہوت ہے۔" ایک بوڑھی بھنگن نے اٹھ کر لہنگا جھاڑتے ہوئے کہا اور اپنی جھونپڑی کی طرف چل دی۔ کرمین کے دماغ نے اس بات کی بہ زور تائید کی: "یہ سچ ہے۔ یہ سچ ہے۔ مگر ———؟"

دلدل میں پھنسی ہوئی گاڑی ذرا چل کر پھر ایک دھکّے سے رک گئی ——— بھنگنیں کب تک بیٹھی اسے تسلّی دیتی رہتیں؟ ان کی جھونپڑیوں سے ذرا ہٹ کر کوڑے کرکٹ کے اونچے اونچے ڈھیروں میں، ان کے ننگ دھڑنگ بچے، ان کے پالتو سؤر اور مرغیاں، اپنی اپنی غذا تلاش کرتے ہوئے آپس میں لڑنے لگے۔ سؤر اپنی سیمابی دموں کی تیزی سے ہلا ہلا کر چیخے، مرغیاں کڑکڑائیں اور بچے چلّا چلّا کر رونے لگے۔ بھنگنیں بیک وقت بھرّا مار کر اپنی جھونپڑیوں کی طرف بھاگیں، ان کے پیروں میں گلٹ کی جھانجھیں زور سے بجنے لگیں، لہنگے پھڑ پھڑائے، وہ سؤروں کے ساتھ بچوں کو مزے مزے کی گالیاں دے رہی تھیں۔ مگر کرمین ایک دم خالی الذہن ہو کر پھر اسی طرف دیکھ رہی تھی، جدھر ذرا دیر پہلے اس کی

بوتی اپنے شوہر کے ساتھ رخصت ہو کر چلی گئی تھی۔ عام دیہاتی لڑکیوں کی طرح روتی چلاّتی بیان کرتی ——— تمیزن جو اس کی زندگی کا تنہا سہارا تھی، آخری امید، اکیلی مونس۔ تمیزن کو گلے لگا کر رخصت کرنے کے لمحے سے لے کر اس لمحے تک اس کی کیفیت ایسی تھی کہ وہ فیصلہ ہی نہ کر سکتی تھی کہ اسے رنج ہے یا خوشی؟ وہ الاؤ کے کنارے بیٹھی تھی، تنباکو کا ڈبہ کھلا پڑا تھا اور چلم اوندھی۔ الاؤ میں اُپلے کی آگ پر راکھ راکھ کی تہیں چڑھتی جا رہی تھیں۔ اور آسمان پر سفید بادلوں کے پہاڑ تیز ہواؤں سے بھنگتے پھر رہے تھے، جس سے جنوری کی ٹھٹھری ہوئی دھوپ بار بار برف کے مارے ہوئے سائے میں تبدیل ہو جاتی تھی اور دور دور تک گیہوں کے ہرے ہرے کھیت گوری کی ساونی چندریا کی طرح لہرا کر ایک ہی طرف جھکتے چلے جاتے، لیکن کریمن کی بوڑھی ہڈیوں میں جیسے اب سردی اپنا اثر کر ہی نہ رہی تھی۔ کیونکہ نہ تو اُسے الاؤ کریدنے سے دلچسپی تھی اور نہ اپنی گاڑھے کی دوہر کو اپنے جسم کے گرد لپیٹنے کی فکر ——— منٹ منٹ پر تنباکو پینے کی خواہش بھی جیسے مردہ ہو چکی تھی۔ کتنی دیر سے تو اس نے چلم کی طرف نظر بھی نہ اٹھائی تھی ——— بس جیسے اس بوڑھی جان نے بیٹھے ہی بیٹھے چپکے سے دم توڑ دینے

کی ٹھان لی ہو۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

بستی کی سرحدی ڈھال پر بنا ہوا کریمن کا کچا گھر بستی سے نکلنے والے اکثر تو بلا ارادہ ہی ڈھال پر لڑھک جاتے اور رکتے جا کر کریمن کے میدان نما آنگن کی اکلوتی دیوار کے سہارے برسوں کا پرانا سڑا چھپر کوٹھری کے آگے تین کبڑی دو شاخی لکڑیوں کے سہارے جھکا ہوا تھا۔ جس کے نیچے جاڑوں میں الاؤ کے اندر جھانکتے اور اپلے سلگتے۔ گرمیوں میں لو دھوپ سے ہاری ننھی ننھی چڑیاں چوں چوں کرتیں اور برسات میں چھپر کے ماتھے پر بوندیوں کی سیکڑوں لڑیوں والا سہرا کپکپاتا اور اس کے نیچے ننھی ننھی ندیاں بہتی رہتیں ـــــــ ہر وہ شخص جو بستی کی طرف سے ڈھلکتا، اسے گرمیوں میں پیاس لگ آتی۔ برسات میں سایہ چاہیے ہوتا اور جاڑوں میں آگ کی گرمی کی چاہ ہوتی۔ یوں ہی بغیر کسی خاص وجہ کے ـــــ کریمن، جو ستر سال سے اسی گھر میں رہتی سہتی سبھی کی مائی بن جاتی۔ لیکن وہ غریب مائی اندر ہی اندر چولھے پر چڑھے ہوئے پانی کی طرح ابلنے لگتی۔ اور بار بار نہایت بے چینی سے پہلو بدلتی جیسے کھٹمل پر بیٹھی ہو ـــــ حالانکہ یہ کوئی نئی بات نہ تھی کہ لوگ ان کے آنگن میں ذرا دیر کو رک جاتے . . . . . ستر سال پہلے جب وہ

گیارہ سال کی ٹھمکتی ہوئی بہو بن کر اس گھر میں آئی تھی اور اس کا ننھا جو میاں اپنے قد سے ہاتھ بھر اونچی لاٹھی لئے زمیندار سے بھی زیادہ شان سے اینڈتا پھرتا تھا، تو بھی بستی سے آنے والے اور بستی کو جانے والے اس کی لڑاکا ساس سے دو باتیں کرنے، پانی پینے یا آگ تاپنے کو ذرا دیر ٹھہر ہی جاتے تھے۔ اس وقت آنگن کی چاروں دیواریں سر اٹھائے کھڑی تھیں اور آنگن سے نکل کر باہر چبوترے پر چھپر تلے اس کی ساس بیٹھی، دروازے پر بندھی گائے بھینس اور دو بیلوں کی کھینی کا ٹھسہ آنے جانے والوں کو دکھا کر لڑنے کے انداز سے باتیں بنایا کرتی۔

خدا خدا کر کے اس کی جان کا روگ بڑھیا ساس مر گئی اور وہ بڑے انتظار اور تمناؤں کے بعد ایک بیٹے کی ماں بھی بن گئی، تب بھی لوگ اس کے دروازے پر رکتے، اور وہ مالکانہ غرور سے اپنے بیٹے کو کوٹھے پر سوار کئے، گھونگھٹ نکالے، ٹھمک ٹھمک کر آنے جانے والوں کو پانی پلاتی، چلم بھر دیتی۔ کوئی منچلا اس سے بھاوج کا رشتہ لگا کر، کسی مبہم سے اشارے کے ساتھ کوئی مذاق کر دیتا، تو وہ بڑی فراخدلی سے بھیا بھیا کہہ کر کہنے والے کی ایسی ویسی بات اسی کے منہ پر دے مارتی ——

وہ اکثر گھر کے کام کاج سے نمٹ کر دروازے میں کھڑی ہو جاتی اور اپنے نک پہنے لال کو کوٹھے پر ہلا ہلا کر، بہلانے کے لئے بکتی: "ہاتھی لایا، گھوڑے

لایا، ہمرا اللہ سب کچھ لایا ۔" حالانکہ اس کا للا ہا تھی گھوڑے لانے کے بجائے گھر کا نقصان ہی لایا تھا ۔ اس کی دادی مر گئی، ایک بیل کو سانپ نے ڈس لیا، دوسرا لنگڑا ہو کر قصائی کے پاس بک گیا ۔ بھینس کے دو تھن سڑ گئے اور اس کا دو دھ سیر دو سیر دن کم ہو گیا ۔ کئی بیگھے زمین پرانے قرضے کے سلسلے میں بک گئی، باپ کے ہاتھ پاؤں تھکنے لگے، اور گاؤں کے نمبردار سے اس کی دشمنی چل نکلی، غرض کچھ پریشانی ہی پریشانی تھی ۔ مگر لوگ ان دنوں بھی اس کی ارمان بھری باتیں سننے کو چلم کے دو کش لینے کو، ذرا کے ذرا رک ہی جاتے تھے ۔

اس کے کئی برس بعد جب اس کا بیٹا اس لائق ہو گیا کہ ماں کی ممتا سے اُکتا کر، بیریوں، جامنوں، اور آموں کے درختوں پر گلہریوں کی طرح چڑھنے کے لئے گھر سے بھاگ سکے تو ایک دن نمبردار کی دشمنی نے فوجداری کی صورت اختیار کر لی ۔ اس کا ادھیڑ عمر میاں اپنے قد سے ہاتھ بھر اونچی لاٹھی لئے نمبردار کے چیلے چانٹوں کو بجھاتا ہوا خود بھی بجھ گیا ہمیشہ کے لئے بجھ گیا ۔ تھانے کی حکومت کا دربار کئی دن تک اس کے چبوترے پر لگنے کے بعد لمبے لمبے نذرانے وصول کر کے ختم ہو گیا، تو بھی اس کا دروازہ ذرا کے ذرا کسی نہ کسی کو رکتے ضرور دیکھتا ۔ وہی بے تعلقی کے رنگ میں تعلق ۔ ایک عادت سی ۔

روتے روتے تھک کر، فریادیں کرتے کرتے اکتا کر، جب اپنے گھر اور کھیت کی دیکھ بھال میں کچھ دلچسپی لینے لگی۔ اس کا بیٹا اپنے باپ کی مضبوط لاٹھی اپنی ٹانگوں کے درمیان لئے، ہاتھ میں نیم کی لچیلی چھڑی پکڑے سارے آنگن میں کودتا پھرتا چل رے میرے گھوڑے ——— اور سڑاسٹر چھڑی سے لاٹھی کی مرمت کرتا جاتا تو وہ اپنے چھپر تلے بیٹھی چرخہ کاتتی یا اناج بینتی اور بار بار، پیار بھری آنکھوں سے بیٹے کو دیکھ دیکھ کر آنے جانے والوں کے سامنے، بیٹے پر اپنی رہی سہی جوانی کا جوگ سادھنے کا اعلان کرتی۔ بیٹے کے لئے ارمان بھری باتیں کرتی اور پھر آپ ہی آپ گنگنا اٹھتی۔

لوگوں کا آنا جانا اس زمانے میں بھی بُرا نہ لگتا۔ جب بیل کی جوڑی دُبلی ہوتی جا رہی تھی۔ کھیت کی مٹی اناج اگلنے کے معاملہ میں کنجوسی برت رہی تھی، اور آنگن کی ایک دیوار گر گئی تھی تو خیر، ایک آندھی باہر کا چھپر بھی لے اڑی تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ مطمئن سی تھی۔ کیونکہ بیٹا جوان ہوتا جا رہا تھا اور وہ بوڑھی۔ اس کے دل کی سہمی سہمی ریشمی خواہشیں اب ایک ایک کر کے مرتی جا رہی تھیں۔ وہ خواہشیں جنہیں بیوگی نے دل کے کسی گوشے میں دبکا دیا تھا۔ اور جو اس دوران میں کبھی کبھار، ساون کے ہرے ہرے، سوندھے سوندھے دنوں میں، اور کنکنوسے کے جاڑوں

کی لمبی لمبی راتوں میں سر اٹھا کر اُسے گدگدا دیا کرتی تھیں —— جوانی مر گئی اور اس سے متعلق پچھلی زندگی کا ہر تصور، ماتا کی ذمے داریوں کے بھنور میں پڑ کر ڈوبتا جارہا تھا، کھوتا جارہا تھا۔ اسے خاموشی تھی اس کا بیٹا جوان ہو رہا تھا، ماں کا کلیجہ فخر و غرور سے ہاتھ بھر کا ہو رہا تھا اب وہ بستی والوں سے کبھی کبھی کسی نہ کسی بات پر لڑ کر بھی خوش ہوتی۔ وہ سمجھتی کہ جوان بیٹا گھر میں ہو تو، باہر کے چار لوگ گھر والوں سے دبتے ہی ہیں۔

بیٹا باپ کی اُس لاٹھی سے جسے وہ گھوڑا بنا کر کھیلتا تھا، اب ایک ایسے سونٹے کا کام لے رہا تھا جس سے وہ سب کو ہنکا سکے —— لاڈلے بیٹے کا شباب محل میں ہو یا جھونپڑی میں —— ہوتا آندھی ہی ہے۔ فرق اتنا کہ محل کی آندھی، دوسروں کا نقصان ہے، اور جھونپڑی کی آندھی جھونپڑی ہی کی بربادی —— اس کا بیٹا اپنے کندھے پر لاٹھی دھرے گاؤں کی گلیوں میں اکڑتا پھرتا، تیری میری بہو، بیٹیوں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں وہی مرض پیدا ہو جاتا، جس سے انسان جان بوجھ کر کانا بننے کی مشق کرنے لگتا ہے —— وہ گاؤں کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ تاڑی پی کر اِدھر اُدھر کی عورتوں کے گھر کئی کئی دن پڑا رہتا پھر جب گھر آتا تو ماں پھر وہی لاٹھی لے کر سیدھا ہو جاتا۔

روپے دے، ڈکریا ـــــ نہیں تو ـــــ" وہ ڈنکارتا۔

بکریاں بک گئیں، مرغیاں بک گئیں، رہا سہا گہنا پاتا بھی بنئے کے پاس رہن ہو گیا۔ اب کریمن اپنے گھر کے سامنے سے ہر گزرنے والے کو روک روک کر اپنے بیٹے کی شکایتیں کرتی۔

"دیکھت ہو بھیا؟ گھر برباد کئے دیت ہیں للاّ۔ کھدا موت دیئے مجھ کو کھ جلی کو۔" وہ چادر سے ناک پونچھتے ہوئے دکھڑا رونے لگتی، لیکن اگر سننے والا اپنی طرف سے بھی کوئی شکایت کر دیتا تو وہ برا مان جاتی اور کسی نہ کسی طرح گھما پھرا کر کہہ دیتی ـــــ "جوان لڑکوا ہے، سب کچھ اوئی کا ہے، اوئی کے باپ کا، پر بھیاّ، پیر موت ہے، دوسرن کے کلیجہ ماں۔"

آخر بہت سوچ ساچ کے اس نے دوسرے گاؤں کی ایک کھری سی لڑکی کو بہو بنا لیا۔ اپنے حساب مست ہاتھی کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ مگر زنجیر بھی بودی ہی نکلی۔ اس کی بہو سے کچھ بن نہ پڑتا تو اسے بیٹے کی بے راہروی کے طعنے دیتی۔ کوسنی اور مار پیٹ پہ آمادہ رہتی۔ اس وجہ سے وہ اکثر رو رو کر چیخ چیخ کر بھنگیوں اور ان کی عورتوں کو جمع کر لیتی، اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر کہتی کہ ہائے یہ ڈائن بہو تو اپنے خصم کو کوستی ہے، یہ چاہتی ہے کہ لڑکا اس کے کولھے سے لگا بیٹھا

رہے —— باہر نہ نکلے۔

اسی طرح آٹھ دن ساس بہو میں ٹھنی رہتی اور کریمن ہر آنے جانے والے کو روک روک فریاد کرتی اور لوگ اُس کے منہ پر اُسی کی سی کہہ کر اس کے آنسو خشک کر دیتے۔

ایک دن ایسا آیا کہ اس کے بیٹے نے توبہ کر لی اور گاؤں کی مسجد میں کبھی کبھار نماز کو بھی جانے لگا۔ مگر یہ اس وقت ہوا جب کھیت رہن ہو کر مٹی رنڈی کے چھپکا جیسے ہلاق تلے ہضم ہو چکا تھا۔ بہو کا گہنا پاتا بیچکر اور کچھ قرض لے کر کھیت کا کئی سال کا سود چکا یا گیا، اور بیمار بوڑھے بیلوں کو گھسیٹ کر کھیت جوتا گیا —— کڑی محنت نے فصل اچھی اگائی مگر پھر وہی سود —— دوسری فصل پر صبر —— دوسری فصل سے پھر تیسری فصل پر ——

بہو ایک پوتی جن کر مرگئی۔ بیٹے کے جسم میں بنئے کا سود گھن بنکر لگ گیا۔ —— کھیت بنئے کا ہو گیا، بیل بنئے کے ہو گئے۔ اور آخر اس کا بیٹا بھی زمین کی ہائے میں دق کر اکے مرگیا ——

رکھنے والے اب بھی اس کے آنگن میں رک ہی جاتے، اس کا دکھڑا سننے کے عوض، پانی یا حقہ پینے کی غرض سے۔

اب کریمن تھی اور اس کی پوتی —— چار گھر کا م کاج کرتی

ادھر اُدھر سے گوبر بٹور کر کنڈے تھاپتی، سوت کاتتی اور فصل پر اپنے ہی کھیتوں پر مزدوری کرتی۔ زندگی کیا تھی، بس جیسے کوئی اپنی زخمی ٹانگ گھسیٹے گھسیٹ کر چل رہا ہو ——— پوتی سات آٹھ برس کی ہوئی تو جیسے کریمن کے ہاتھ پاؤں بالکل ہی تھک گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے دشمنوں کے نرغہ میں گھرا ہوا تنہا مقابل، اپنے کسی ہمدرد کو دیکھ لے اور پھر اپنے جسم کی کل قوت اچانک کھو کر بس رو پڑے اس کے تھکے ہارے جسم نے اپنی پوتی تمیزن کا سہارا لیا، اور وہ ننھی سی جان، جلدی ہی کما ؤ پوت بن گئی۔ دیکھنے والے تعریف کرتے کہ دیکھو لڑکی کیسی خدمت کر رہی ہے، اور کریمن کا سینہ خوشی اور فخر سے پھول جاتا۔ وہ اپنی پوتی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتی۔

تمیزن تمام دن گھر سے باہر رہ کر کام کاج کرتی رہتی اور کریمن گھر میں پڑی کھانستی اور رتبا کو پیتی رہتی، مطمئن اور یک گونہ آسودہ ——— شام کو تمیزن چند پیسے یا اناج لئے گھر آتی۔ خاک دھول میں اٹی ہوئی۔ پنڈلیوں پر سے ڈھیلے چوڑے دار پاجامے، اور جھبڑے بالوں میں تنکے اٹکائے۔ کریمن اٹھ کر اس کی بلائیں لیتی، منہ بھر بھر دعائیں دیتی، پھر دونوں سر جوڑ کر صبح کا پکا یا ہوا کھانا

کھاتیں۔ اسں دوران میں کریمن گاؤں بھر کے لوگوں کی برائیاں کرتی اور ناک بہاتی رہتی —— اور تمیزن جلدی جلدی نوالے نگلتے ہوئے سر میں جوئیں ٹٹولتی جاتی، خاموش اور فکرمند سی۔ وہ دونوں اس طرح بیٹھی ہوئی بڑی عجیب سی لگتیں۔ بس جیسے میاں بیوی ہوں، پرانے میاں بیوی۔

مگر جس دن ان کے گھر کی ایک اور دیوار گری، اس دن کریمن پورے وقت گڑے مُردے اکھاڑ اکھاڑ کر خوب روئی، اور اپنی مصیبتوں کے دن شمار کیے۔ اسی اثنا دھری میں جلنے کے لیے ایک موٹا سا کانٹا اس کے کلیجے میں چبھ گیا۔ یعنی اسے معلوم ہوا کہ اس کی پوتی تو تیرہ برس کی ہو رہی ہے —— اس کے سینے میں جیسے انگیٹھی سلگ اٹھی۔ آنسو خشک ہو گئے اور پرانی یادیں بھی اس آگ میں بھسم ہو گئیں۔ اسے یاد آنے لگا کہ کچھ دن سے آنے جانے والے لوگ تمیزن کی طرف زیادہ دیکھتے ہیں۔ اور تمیزن بھی ایسے موقعوں پر ادھر اُدھر ہی منڈلاتی رہتی ہے۔ بس جیسے اس کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ ستر سال پہلے سے آج تک، لوگ اس کے گھر کے سامنے محض اس لیے رکتے ہیں کہ اس کی تیرہ برس کی پوتی کو دیکھ سکیں —— لوگوں کی زبانی ہمدردیاں صرف اس کی پوتی کو جھپٹنے کا پیش خیمہ ہیں۔ اسے ایسا لگا کہ وہ لوگ جو کبھی کھانستے تھوکتے

اس کے دروازے آکر بیٹھ جاتے تھے اور جنھیں مرے ہوئے اب عرصہ ہو گیا، وہ سب کے سب اپنی اولادوں کے کانوں میں پھونک گئے ہیں کہ دیکھو کریمن کی پوتی ـــــــ بس اسی دن سے کریمن کے دل میں وہ کانٹا ہر وقت کھٹکنے لگا۔ ان احساسات نے اس کے بوڑھے خشک دماغ کو جیسے جکڑ کر رکھ لیا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ تمیزن کو دنیا کی نظروں سے چھپا کر کہیں رکھ دے۔ بالکل ان چاندی کے چھلّوں اور چوڑیوں کی طرح جنھیں اس نے ہنڈیا میں بند کر کے کوٹھری کے ایک کونے میں دفن کر دیا تھا۔ اور پھر تمیزن کو اس وقت نکالے، جب چاندی کے چھلے اور چوڑیاں پہنا کر اسے اس کے دولہا کے ساتھ رخصت کرے ـــــــ مگر یہ کمبخت پیٹ کی آگ بھی تو بری چیز ہے حتیٰ کہ خاندان کی عزت کے خیال سے بھی یہ آگ نہیں بجھتی اور بجھتی ہے تو صرف روٹی سے ـــــــ اور روٹی کوئی آسمان سے برستی ہے جو کریمن بٹور لیتی ـــــــ تمیزن کھیتوں پر مزدوری کرتی رہی، گھروں میں غلامی کرتی رہی اور کریمن گوشۂ عافیت سے اٹھ کر اپنے حساب سورج کی چمک کو اپنی چادر میں لپیٹتی۔ تمیزن کام کرتی اور وہ اس کے پیچھے لگی پھرتی۔

"ارے تمیزن سر پر اوڑھنیا لے ـــــــ! حرامجادی کا ہوس نا ہیں رہت ہے!" وہ اس لاٹھی کو زمین پر دھمک کر کہتی، جسے اس کا شوہر ہاتھ میں لیکر اپنے کھیتوں میں گرجتا پھرتا تھا۔ وہی لاٹھی جس نے نمبردار کے چیلے چانٹوں

کو زمین پر بچھا دیا تھا - وہ لاٹھی جسے اس کے بیٹے نے گھوڑا بنایا تھا، جسے وہ دوسروں کی بہو بیٹیوں اور اپنی ماں پر رعب ڈالنے کی غرض سے کندھے پر رکھ کر اکڑتا پھرتا تھا - وہ لاٹھی جو اس کے بیٹے اور بہنوئی کے درمیان سود کا لامتناہی تار منقطع کرنے میں بیکار ثابت ہوئی تھی - وہی لاٹھی اب اس کے ہاتھوں میں تھی، جو اب آدھی سے زیادہ ٹوٹ چکی تھی، اور جس سے اب وہ اپنی سوکھی سہمی، ٹھٹھری ہوئی پوتی کی عزت آبرو پر پہرہ دے رہی تھی -

"ہٹ بڑھیا!" دوسرے مزدور کمین کی لپ جھپ سے جھلا جاتے، اور بعض تو اسے دھکا دینے سے بھی نہ چوکتے ——— "الحمد للہ ارے بھیا!" کمین مار کھاتی ہوئی کتیا کی طرح خوشامد سے دم ہلاتی ایسی جگہ جا بیٹھتی جہاں سے وہ تمیزن کی نقل و حرکت کو بخوبی دیکھ سکتی ——— وہ ڈانٹنے پھٹکارنے والوں سے گھگیانے پر خود کو شرمندہ پاتی - مگر اسے کیا کیا جائے کہ جوان لڑکی گھر میں ہو تو وقت بے وقت چار لوگوں سے دبنا ہی پڑتا ہے - وہ بیٹھی اپنی پوتی کی ایک ایک حرکت کا غور سے معائنہ کرتی رہتی مارے فکر کے اس کا منہ اس طرح چلتا رہتا جیسے وہ کچھ چبا رہی ہو ——— آنکھوں اور ناک سے پانی بہنے لگتا اور بیٹھے بیٹھے کمر دکھنے لگتی، لیکن وہ ضدی بچوں کی طرح اڑی ہی رہتی - کالی کالی ہنڈلیاں اور میلی دھوتیاں اور لنگوٹیاں، دھنسے ہوئے پیٹ، تھکے ہوئے سیاہ چہرے ———

وہ یہ سب اپنی جوان پوتی کے گرد دیکھتی۔ اسے آنکھ جھپکاتے بھی ڈر لگتا کہ کبھی کوئی کلموہا اس کی پوتی کے کورے پنڈے سے نہ چھو جائے ——— جب اس سے نہ رہا جاتا تو وہ پھر رینگتی ہوئی اپنی پوتی کے قریب آجاتی اور اُسے نظر بچی رکھنے، اوڑھنی اچھی طرح اوڑھے رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے دو چار گالیاں دے دیتی۔ کام رکنے پہ کوئی پھر کریمن کو ڈپٹتا اور آئندہ اس کی پوتی کو کام نہ دینے کی دھمکی دیتا تو وہ بظاہر گھگھیاتی اور زیر لب کوستی کالتی، ادھر اُدھر رینگ جاتی، اور ایک عجیب سے اضطراب کے پنجوں میں گرفتار ہو جاتی اس کی لٹکی ہوئی چنٹ دار جلد پہ کوئی چیز رینگتی رہتی سرسراتی رہتی، جسے وہ نہ دیکھ سکتی تھی نہ چھو سکتی تھی اور نہ اس کا نام بتا سکتی تھی گلے میں آنسو کنکر بن کر ٹھنس جاتے اور دماغ پر جیسے لوہے کے تار سے کسنے لگتے، آنکھوں سے سفید گدلا پانی بہتا رہتا اور منہ برابر اس طرح چلتا جیسے وہ کچھ چبا رہی ہو ——— زندگی کی سختیوں نے اس کے گزرے ہوئے بہتر زمانے کو اس کے ذہن میں دھندلا دیا تھا، اپنا مستقبل اس کے لئے بے معنی تھا، مگر حال کی کیفیت اس کی تمام حسیات کو ہر طرف سے نرغے میں لئے ہوئے تھی، ریگستان کی آندھی میں پھنسا ہوا مسافر ریت کے علاوہ کیا دیکھے اور کیا چھوئے؟ ———
جتنی دیر تمیزن کام کرتی، کریمن سوچتی رہتی کہ آج تو خیر، مگر کل سے وہ تمیزن کو گھر سے قدم نہ نکالنے دے گی: چاہے دونوں بھوک سے مر کیوں نہ جائیں

جوان لڑکی اور اس کے ارد گرد رہنے والوں کا بھروسہ ہی کیا۔ جوان لڑکی تو کنویں پر کی کائی ہے بھلا کسی کا پاؤں پھسلتے دیر لگتی ہے؟ ——— اس کے سوچ بچار کا سلسلہ ٹوٹتا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ سارے زمین پر پھیلتے ہی پھیلے جاتے کسان مزدور سبھی تھک کر گھر لوٹنے کی تیاری کرنے لگتے، کھیتوں کی مینڈھیں سونی ہو جائیں، اور کتے چلّانے لگتے، تمیزن مزدوری کے پیسے یا اناج ——— (جس میں تھوڑا بہت چوری کا بھی شامل ہوتا ہے) لے کر کرمین کے پاس آجاتی اور کرمین کو تو جیسے پھانسی کی سزا معاف ہو جاتی۔

"ارے توری چٹیا اکھاڑ لیہوں، بتا تو نوناسے کا بات کرت رہی؟"

کرمین چلتے چلتے رک کر کڑی آواز میں جھوٹ موٹ پوچھتی، یونہی تمیزن کی تھاہ لینے کو اور تمیزن ایسے کرب سے اچھل پڑتی، جیسے واقعی اس کی چوٹی اکھاڑی جا رہی ہو۔

"ہائے دیا۔ ہم کہاں بولت ہیں اوسے" وہ معصوم حیرت سے منمنا کر جواب دیتی اور کرمین کے دل کا وسوسہ اور بھی پاؤں پسار لیتا۔ اُسے تمیزن پر اور بھی غصہ آنے لگتا اور اس کے ہاتھ کی گرفت لاٹھی پر مضبوط ہو جاتی وہ سوچتی کہ یہ انکار اور یہ حیرت تمیزن کے پکے پن کا ثبوت ہے۔ تیرہ برس کی لونڈیا جو ہر وقت مردوں میں گھری رہتی ہے، بھلا وہ اتنی معصوم ہو سکتی ہے؟ جب وہ خود نرا دس سال کی تھی، تو تبھی سے زندگی

کی ان ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں کو پہچاننے لگی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ اکثر اپنی بھینس چرانے جنگل جایا کرتی تھی تو بار ہا پکی پکی جامنیں اور آم دیکھ کر درختوں پر گلہریوں کی طرح چڑھ جاتی تھی ——— انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک دن وہ جامن کے درخت پر چڑھی، جامنیں کھا رہی تھی کہ ادھر ایک چرواہا آنکلا۔ اُسے اوپر دیکھ کر وہ چلّایا "باپ رے باپ جادو رکھت ماں اتی اتی بڑی جامن پھلت ہیں" اور کرمین نے اپنے کالے کالے ہاتھوں کو دیکھ کر فوراً سمجھ لیا تھا کہ جامن کون ہے۔ اس لئے وہ اس وقت تک درخت سے نہ اتری جب تک کہ دوسرے چرواہے اور چرواہیاں ادھر نہ آ گئیں ——— اور ایک یہ تمیزن کہ نتھی ہی بنی جاتی ہے کہ کرمین کے جی میں آتا کہ تمیزن کے منہ پر اتنے تھپڑ لگائے کہ وہ اپنے جی کی بات جھٹ اُگل دے، تاکہ اُسے اس کوفت سے نجات مل جائے کہ تمیزن گھُنّی ہے۔

یہ حالت تو ہوتی ان دنوں جب مزدوری ملتی، اور جن دنوں بیکاری ہوتی اور جمع کیا ہوا اناج سسک سسک کر خرچ کیا جاتا تو دروازے رکنے والوں کی کوفت اُسے اور چباتی رہتی۔ وہ غریب کسی کو رُخ دے یا نہ دے مگر لوگ ہیں کہ وہ پھونکیں رتنا کو پیٹے بغیر دم دیئے دے رہے ہیں بغیر پانی پیئے حلق میں ڈھول اڑی جا رہی ہے۔ نانی دو گھونٹ پانی دے مائی دو پھونک جمنا کو بلا دے" ——— اور مائی بے چاری اندر ہی اندر ملتی

رہتی ۔ تمیزن کو کوٹھری میں سنبھالے رکھتی اور خود آنگن یا چھپر میں بیٹھی قلعہ کی فصیل کا کام دیتی ۔ اپنی آنکھوں سے بساط بھر کام لیتی ۔ ہر ایک کی آنکھوں پر نظر رکھتی کہ کہیں کوئی اس کی پوتی کو نگاہوں کی لاسلکی کے ذریعے کوئی پیغام نہ دے دے ـــــــ یہ تو خیر تھا ہی مگر جو اجنبی بھی اپنے راستے جاتا ہوتا ، تو کریمن کھٹک جاتی ، بکھر جاتی اور منہ ہی منہ میں کوسنے کاٹنے لگتی ـــــــ رات رات بھر اسے اچھی طرح نیند نہ آتی ، تمیزن قریب ہی اپنی گدڑی پر پڑی بے خبر سویا کرتی ، لیکن وہ کھانس کھانس کر ، تھوک تھوک کر ، اور تماکو پی پی کر ، بستی بھر کے مردوں کو اپنے خیال میں اپنی پوتی کے شوہر کی حیثیت سے لاتی اور پھر حساب لگاتی کہ ان میں سے کتنوں نے اس کی پوتی کو اپنی بہو بنانے سے انکار کر دیا ہے ۔ کہنے والے کہتے "دے گی کیا بڑھیا ؟ دھرا ہی کیا ہے اس کے پاس ! تیری میری غلامی کر کے تو آدھا پیٹ کھانے کو ملتا ہے دونوں کو ـــــــ بہویں تو ماری ماری پھرتی ہیں ۔ روپیہ اور جہیز بھی تو ملے ـــــــ دوسرے پھونس بڑھیا کی پوتی ، جس کے دروازے سبھی رک جاتے ہیں ، کون سی اچھی ہو گی ـــــــ ؟ اور رلو نڈیا ہے بھی تو ٹھٹھری ہوئی سی ، گوشت تک نہیں بدن پر ، بس جھولی بھر ہڈیاں ہی تو ہیں ـــــــ " یہ سب باتیں کسی نہ کسی طرح کریمن کے کانوں تک پہنچ ہی جاتیں ۔ اسی لئے رات کی خاموشی میں اس کا جی چاہتا

کہ بس بجلی بن کر گاؤں پر گرے اور سب کو بھسم کر ڈالے۔ ایسے ناشکرے اور تھے بھی کس لائق۔ کیونکہ وہ تو محض اپنے گھرانے کی آبرو برقرار رکھنے کی خاطر اپنی زندگی کے آخری سہارے کو دوسروں کے ہاتھ سونپنا چاہتی تھی اور دوسرے کمبخت ایسے مست! رات بھر چراغ کی روشنی میں آنکھیں چندھیا چندھیا کر وہ اسی ادھیڑ بن میں لگی رہتی۔ کبھی دنیا بھر کی بربادی کی دعائیں مانگتی۔ اور کبھی تھکی ہاری سوئی ہوئی تمیزن کے سوکھے جسم پر اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھ پھیر پھیر کر سوچتی کہ کل سے وہ ایک روٹی کے بجائے آدھی ہی کھائے گی اور آدھی بچا کر تمیزن کے حصے میں شامل کر دیا کرے گی، تاکہ کچھ تو گوشت آجائے اس پر، لوگ جانور بھی خریدتے ہیں تو موٹا تازہ دیکھ کر، پھر یہ تو بہو کا معاملہ ہے ——

اور کبھی سوچتی کہ اللہ، تمیزن کی مزدوری میں اتنی برکت دے دے کہ وہ اس کے بیاہ کے لئے بہت سے زیور اور کپڑے بنا کر بستی بھر کی ماؤں کے سامنے نمائش کرے۔ پھر تو یقیناً تمیزن کی ہڈیاں چھپ جائیں گی۔

مگر ہر رات کریمن کے لئے ایسی ہی گتھیاں لاتی رہی، جسے وہ ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی روشنی میں سلجھانے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر دو سال اور گزر جانے کے بعد بھی وہ گتھیاں جوں کی توں تھیں۔

سانگ کٹ چکا تھا اور تمیزن بیکار بیٹھی تھی۔ گھر میں اناج کافی تھا

اور کرمین کے ڈبے میں تمبا کو بھی ـــــــ مگر کرمین پہلے سے زیادہ بے چین تھی ـــــ وہ دن بھر چن چن کر تمیزن میں عیب نکالتی، اُسے گالیاں دیتی اور زیادہ وقت اسے کوٹھڑی میں بیٹھنے پر مجبور کرتی اور تمیزن بھی ایسی بے منہ کی کہ مٹی کے مادھو کی طرح تمام تمام دن کوٹھڑی میں ٹانگیں پسارے بیٹھی رہتی، یا میلے چیتھڑے گانٹھتی رہتی، انہی دنوں سامنے رہنے والی بھنگنوں، اور آنے جانے والوں نے دیکھا کہ کرمین خلافِ عادت، ایک شخص سے گھُل مل کر کھسر پھسر کرتی ہے۔ وہ شخص جو اس بستی کا رہنے والا نہیں تھا اور جس کی کمر اور زردی مائل سفید مونچھیں جھکی ہوئی تھیں۔ لوگ بڈھے کو دیکھ کر اپنی مائی کے متعلق آپس میں پھبتیاں کستے، اور بھنگنیں کہتیں کہ بڈھا ضرور مالدار ہوگا ـــــــ مگر یہ دونوں خیال غلط تھے ـــــــ ہاں یہ ضرور تھا کہ کرمین پہروں بڈھے سے سر جوڑے اسے دیکھتی رہتی۔ گہری گہری موچنا جیسی نظریں جو بال کی کھال بھی اتار لیں ـــــ!

"مائی سجلے (نزلے) سے بال اُجمد اُجلے، ہو گئے" وہ بڑی حسرت سے کہتا، اور کرمین کا نزلہ بڈھے کے اس نزلے پر گرتا جس نے اُس کے بال سفید کر دیے تھے۔

"آگ لگے نچلے کا ــــــ جوان جوان بگلے کا یہ نخرات ہیں۔

کھیر" کریمن پپوٹے پیٹ کر کہتی اور اپنی غلیظ آنکھیں، اس کے بہرے پر جما کر تصور میں سفید بالوں کو سیاہ دیکھتی۔

"ہمرا جوان لڑکا جات رہا تو ہمری کمر جھک گئی" بڈھا اس طرح شرما کر کہتا، جیسے کوئی نئی دلہن اپنی بے عصمتی کی صفائی پیش کر رہی ہو میاں کے سامنے ــــــ جواب میں کریمن کو اپنا مرا ہوا بیٹا یاد آکر رلانے لگتا۔

"ہاں للا! کمر ٹوٹ جات ہے۔ کھیر!" وہ ہر کردی گولی سٹ سے نگل کر ایک ٹھنڈی سانس لیتی اور پھر گھسر گھسر میں لگ جاتی۔

کریمن کئی مہینے سوکھی گھاس کھیر (خیر) کے چھینٹوں سے ہری کرتی رہی، کیونکہ وہ اپنے دل کو سمجھانے کے لئے اپنی چہیتی پوتی، اپنے خاندان کی آخری نشانی کو اپنی زندگی کے آخری سہارے کو اس پر چپنے کے لئے چھوڑنا چاہتی تھی ــــــ آنے جانے والے اب بھی ذرا کے ذرا اس کے آنگن میں رک ہی جاتے، مگر کریمن بڈھے کے راز کو اپنی زبان سے نہ نکالتی۔ اسے ڈر لگتا کہ کہیں کوئی بڈھے کو بہکا نہ دے۔

آخر ایک دن مسجد کے ملّا جی نے کریمن کے گھر سے نکلتے ہوئے

ایک ایک کو بتانا شروع کیا، ـــــ "کریمن کے داماد خبیث نے نکاح پڑھوائی صرف اٹھنّی دی ـــــ مردود کہیں کا۔ ـــــ دیکھ لینا تمیزن خوش نہیں رہے گی"

لوگوں نے سنا تو نہ حیرت، نہ خوشی اور نہ رنج۔

اور آج دوپہر ڈھلے تمیزن سرخ گٹھری بنی عام دیہاتی دلہنوں کی طرح سلئے میں کوتے۔ تین کمتی، لنگڑی گھوڑی پر بیٹھ کر جھومتی جھامتی اپنے دولھا کے ساتھ چلی بھی گئی۔

اور کریمن کو ذرا دیر کے لئے محسوس ہوا کہ اس کی پونجی دوسرے کے کیسے میں گر گئی ہے۔ اور اب وہ کھوئی کھوئی سی ایک بیکار شئے کی طرح الاؤ کے کنارے پڑی تھی ـــــ تمیزن کے رونے کی آواز اب تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی اور تمیزن کے شوہر کا چہرہ، نظروں کے سامنے پھیلتا ہی چلا جا رہا تھا۔ ٹھوڑی پر گری ہوئی سفید مونچھیں اور اکا دکا جھولتے ہوئے دانتوں کی ہنسی، جیسے وہ سراپا نزلے کی تصویر ہو۔ اور کریمن اس طرح ڈھیلی ڈھالی اور کھوئی سی الاؤ کے کنارے پڑی تھی، جیسے وہ نزلہ

اسی پر گر پڑا ہو۔

جنوری کی ٹھٹھری ہوئی دھوپ دنیا والوں سے "تاں جھاں" کا کھیل کھیل رہی تھی اور سرد ہوا درختوں کی تپلی تپلی ڈالیوں سے زور آزمائی کرتے ہوئے گنگنا رہی تھی ——— بھنگنیں اب آپس میں کسی بات پر جھگڑ رہی تھیں۔ اور اُن کے بچے پھر سوروں اور مرغیوں میں ملے جُلے کوڑا کرید رہے تھے۔ مگر کرمن جوں کی توں بیٹھی تھی۔ تھکی ہاری، کھوئی کھوئی سی۔

اچانک پھر اُسے جیسے کچھ یاد آ گیا۔ اُس نے مُڑ کر اپنا تھر تھراتا ہوا ہاتھ بڑھایا اور ایک طویل سانس لے کر لاٹھی کے سہارے غیر معمولی تیزی سے کوٹھڑی میں پہنچی۔ دیوار پر ٹنگی ہوئی گٹھڑیاں اتار اتار کر ان میں کچھ تلاش کرنے لگی ——— بڑے عزم۔ بڑے اطمینان سے لیکن جب کچھ نہ ملا تو اپنے جسم کے گرد لپٹی ہوئی گاڑھے کی دوہر زمین پر بچھا کر سجدے میں گر گئی ——— جذبۂ عقیدت و تشکر سے بھری ہوئی ——— اُسے باقاعدہ نماز عمر بھر نہ آئی ——— آج بھی بس وہ سجدہ ہی کر رہی تھی، جو کہ اُس نے اپنی پوتی کے بیاہ کے لئے جانے کب سے مان رکھا تھا۔

"اے اللہ ——— اے اللہ!" وہ جانے کن الفاظ میں خدا کا شکر ادا

کرنا چاہتی تھی، لیکن الفاظ اس سے دامن بچا رہے تھے۔ مگر پھر سجدے میں پڑے پڑے دفعتاً اسے جانے کیا ہوگیا کہ ہچکیاں لے لیکر رونے لگی اور سجدے کے بجائے کروٹ لے کر اپنے پاؤں زمین پر زگڑنے لگی،

"اب کوئی ناہیں آوت ہیں —— داڑھی جارے اپنی اماں کے کھسم (خصم)، ان کے جنازے نکلیں ——"

وہ ضدی بچوں کی طرح جانماز پر پڑی آنے والوں کو گالیاں کوسنے دے رہی تھی —— اور بستی سے آنے والا ایک ادھیڑ عمر آدمی ممتا کو پینے کی خواہش میں، اس کے آنگن میں حیران کھڑا تھا۔

سنہ ۱۹۷۵ء

بڑے انسان بنے بیٹھے ہو؟

چلو بس رہنے بھی دو ——— بڑے انسان بنے بیٹھے ہو ——— !

میرا تو جی چاہتا ہے کہ شیشے کے اس قمقمے میں سے آنسو بن کر ٹپکنے لگوں، جس میں تم نے مجھے قید کر کے اس کلموہی سڑک کنارے اونچے سے کھمبے پر یوں لٹکا رکھا ہے جیسے میں کمبخت نہ ہوئی طوطا مینا ہوئی جو پنجرے میں بند کر کے لٹکا دی گئی ——— بس ٹپ ٹپ میرے آنسو گریں اور تم اور تمہاری دھرتی ایک آتشیں سیال میں بہ جائے ——— آہا! یہ خیال مجھ دکھیاری کے لئے کتنا دلچسپ، کس قدر پیارا ہے ——— مگر وہی بات کہ قیدی بادشاہ ایک کتے کو بھی مروا لینے کا حکم دے، تو اس کا حکم کون بجا لائے گا؟ پھر میں بھی تو تمہاری قیدی ہوں ———

ایسی قیدی جس سے ہر طرح کی غلامی کرداتے ہو، اور بھر اکڑتے ہو،
اتراتے ہو ــــــ اس طرح جیسے مجھے تپانے چڑانے کو کہہ رہے
ہو کہ بھئی ہے کوئی کرۂ ارض پر ہمارا مقابل! چھی! کیا چھچھورا پن ہے،
ــــــ یہ ٹھیک سہی کہ تم فطرت کی آخری اولاد ہو، یعنی پیٹ پونچھنے!
کون نہیں جانتا کہ ماں کو اپنی آخری اولاد عزیز ہوتی ہے، یہی وجہ تو ہے
کہ ماں اپنی ڈھکی چھپی، وقت بے وقت کو رکھی ہوئی چیز بھی اُسی کو دے
مرتی ہے ــــــ لیکن بھئی یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ پیٹ پونچھنی
اولاد اختیار پاکر کمینوں کی طرح سب کے لئے جنجال بن جاتی ہے ــــ
اپنی ہی کہو کہ تم نے اس کرۂ ارض پر کیا کیا نہ کرتب دکھائے ــــــ
کیسی کیسی دل ہلا دینے والی لوٹیں نہ لگائیں ــــــ جب دیکھو
جیب کائنات سے ادھار کھائے بیٹھے ہو۔ بے بات کی بات پر مچلے ہوئے
ہو۔ کبھی ستارے نوچنے کو ہاتھ بڑھایا تو کبھی چاند کو گیند بنا کر ٹھکرانے
کی کوشش کی۔ عناصر تک سے ہتھاپائی پہ اتر آئے۔ غرضیکہ مادر فطرت
کے بوڑھے پنڈے سے اس کا ایک ایک زیور کھسوٹ لینے کی کوشش
کی ــــــ کمبخت ندیدوں کی طرح جو سامنے دیکھا جھپٹ کر اپنی جیب میں
ڈال لیا ــــــ۔ اب تمہیں جتنا لگے تو میری بلا سے ــــــ جی جلے گا
تو زبان چلے ہی گی۔ میں تو کھری کھری کہوں گی اس وقت! ہو نہیں

ندیدے۔ اچکّے کہیں کے ـــــــ ؟ دور کیوں جاؤں، لو میں ہی تمہارے جبر اور ظلم کی زندہ مثال ہوں۔ ہائے کیا دن تھے جب میں اچھی بھلی بادل میں چمکتی تھی۔ تھرکتی تھی۔ ناچتی تھی۔ آبشاروں میں چھپ کر گاتی تھی۔ خوش تھی، آزاد تھی۔ تم میری ہلکی سی جھلک سے مرعوب ہو کر کانپنے لگتے تھے، مجھے سجدے کرتے، میری پوجا کرتے تھے ـــــــ لیکن ایک دن لیا آیا کہ تم پر بھوت سا سوار ہوا اور تم نے مجھے ڈھونڈھ ڈھانڈ کر پکڑ لیا ـــــــ میں ہزار تڑپی۔ لاکھ بلبلائی ـــــــ مگر آج حال یہ ہے کہ تم مجھ سے دنیا بھر کے کام کروا لیتے ہو۔ ریلیں مجھ سے گھسٹواؤ۔ لاکھوں ٹن کا بوجھ مجھ سے اٹھواؤ۔ حد تو یہ ہے کہ اپنا کھانا تک مجھ سے پکوا لیتے ہو۔ اس کے علاوہ راتوں کو مجھے شیشے کے قمقموں میں بند کر کے دھڑلے سے جلاتے ہو اور پھر تمہیں شرم نہیں آتی کہ میری روشنی میں جی کھول کر ہر لمحے نت نئے سوانگ رچاتے ہو۔ جیسے میں اندھی ہوں۔ جیسے میرا کلیجہ نہ ہوا پتھر ہوا۔ ایسا اندھیر بھی کیا۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ آنسو بن کر ٹپک جاؤں اور تم اور تمہاری یہ دھرتی آتشیں سیال میں غرق ہو جائے ہاں نہیں تو ـــــــ !

اب دیکھو! یہ رات اور میری تنہائی۔ کوئی ساتھ رونے والا ہو تو اپنے آنسو گالوں پر چنگاری بن کر نہیں لڑھکتے۔ آس پاس کی ساری

بتیاں آج پتھر بازی کی نذر ہو گئیں۔ ایک ہم ہی بچی ہوں، جو یوں اکیلی جل رہی ہوں اور اپنے نصیبوں کو کوس رہی ہوں ——— اُف بھئی! ہر طرف کیا سناٹا ہے۔ خوف و دہشت سے لدا پھندا ہوا سناٹا کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے بے شمار چیخیں، لاتعداد کراہیں، ماحول کے گداز سینے میں گھٹی ہوئی ہیں۔ اور آسمان پر کالے کالے بادل جیسے جم کر رہ گئے ہیں، اور نم ناک ساحلی ہوائیں ٹھٹکی ہوئی سی ہیں جیسے وقت پتھر کا بُت بنکر نصب ہو گیا ہے، اور رات رینگتے رینگتے مر گئی ہے اور ہائے رے، مجھ کمبخت کا کلیجہ جیسے اس جنازے کے سرہانے لوبان بنکر سلگ رہا ہے۔ اور یہ سڑک آج سرِشام سے چپ کیوں ہے۔ یہ ڈامر کی ناگن آج کچلی ہوئی سی کیوں ہے؟ جانے کیوں آج اسے دیکھ کر بار بار میرے اندر سے جلتے ہوئے قہقہے ابلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی اس بیرن، کمہاروں کے جوتوں تلے رہنے والی اس کمینی سڑک پر ہنسی کا لاوا بہا دوں۔ یہ سڑک ہے بھی تو تمہاری چہیتی۔ اس پر تو تم نے میرے دیکھتے دیکھتے بیشمار سوانگ رچائے ہیں۔ اور بھئی ایکٹر کو اپنا اسٹیج پیارا نہ ہوگا۔ تو پھر کسے ہوگا؟ آہا! کل تک یہ سڑک میری روشنی میں بن سنور کر کیا اتراتی تھی۔ اور آج ——— ذرا مجھے بتاؤ تو سہی کہ تمہاری اس چہیتی کا سنگار کس نے لوٹ لیا۔ وہ چمکیلی کاریں کیا ہوئیں، جو ہر لمحے اس پر

سے کسی رنگین تخیل کی طرح گزرتی تھیں۔ اور وہ سوکھے مارے قلی آج کہاں ہیں جو سر پر بوجھ لادے کمینے کیڑوں کی طرح رینگتے پھرتے تھے۔ وہ خوبصورت ریشمی کپڑوں والی تھرکتی عورتیں کیا ہوئیں؟ کیا آج وہ ریشم کے کیڑوں کی تلاش میں کہیں دور نکل گئی ہیں؟ اور میلے کچیلے کپڑوں والی بدصورت عورتوں کے ہاں کیا آج گھر بیٹھے ہی عرش سے خوانِ نعمت اترا ہے جو سڑک پر اپنی ضروریات کے لئے دوڑتی بھاگتی نظر نہیں آتیں۔ اور وہ گبرو جو سڑک پر آنکھیں مارتے، تھوک نگلتے پھرتے تھے، وہ کہاں ہیں۔
ایسا لگتا ہے کہ جیسے آج قحبہ خانوں نے خیراتی دن منایا ہے ——
توبہ! آج نہ تو ریڈیو کے نغمے ہیں، نہ بھکاریوں کی صدائیں۔ نہ بھوکے بچوں کی ریں ریں، نہ پیٹ بھروں کے قہقہے —— واہ بھئی!
آج یہ تضاد کی جنی ہوئی رونق کہاں منہ چھپا گئی؟

تم انسان یوں تو ساری مہذب دنیا میں یوم منانے کے سلسلے میں کافی ذہین ہو مگر خصوصیت سے کرۂ ارض کے اس تین کھونٹ والے دھبے میں —— جسے ہندوستان کہا جاتا ہے۔ یوں مذہبی طور پر سال میں تین چوتھائی دن تمہارے منائے جانے والے "دن" ہوا کرتے ہیں جن میں تم اکثر اس قدر خوش ہوتے ہو کہ ایک دوسرے سر پر اینٹ پتھر بجاتے ہو، مگر ادھر بطور فیشن تم سیاسی دن بھی منانے لگے ہو ——

اور آج بھی تو تم ایک دن منا رہے ہو۔

بہرحال آج اس یوم مبارک کے صدقے میں مجھ قیدی کو یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ تمہارے ہاں انسانوں میں چونکہ عام مفہوم میں خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا، اس لئے آج اس رشتے کی ابتدا دونوں قسم کے انسانوں نے بڑے زوروں سے کر دی۔

یہ کام شروع میں تو اس بے جگری سے ہوا کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ آج خون کا رشتہ اتنا مضبوط ہو جائیگا کہ خون ہی خون رہے گا۔ اور باقی سب کچھ ختم ہو جائے گا ــــــ مگر اسے کیا کیا جائے کہ تکونے دھبے کے باسیوں کا ہر کام کڑھی کا اُبال مشہور ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اب اس ہولناک سناٹے میں ٹکر ٹکر یہ سڑک تک رہی ہوں۔ یہ تمہاری بنائی ہوئی سڑک! ــــــ جس پر آج بارود، تیزاب اور رِستے ہوئے لہو کی ملی جلی بُو اس طرح قبضہ جمائے ہوئے ہے جس طرح تم فطرت کی ہر قوت پر قابض ہونے کے متمنی ہو ــــــ جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے پر قابض ہونا چاہتے ہو۔ ــــــ

چلو بس رہنے بھی دو ــــــ بڑے انسان بنے بیٹھے ہو؟ مجھ سے کیا چھپاؤ گے؟ میں تو تمہارے گھر کی بھیدی ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ لنکا نہ ڈھا سکوں۔ میں نے تو تمہیں دنیا کے ہر کونے میں ننگا کھلا بھی

دیکھا ہے ۔ میں تو تمہاری خلوت اور جلوت سبھی تکے بیٹھی ہوں ——— کیا
تم سمجھتے ہو کہ قیدی کے لئے اندھا ہونا بھی ضروری ہے ؟ کہیں اور کے
لئے کچھ نہیں کہتی ——— میں اسی سڑک کنارے چل چل کر بہت کچھ
دیکھ چکی ہوں ——— شہر کی گہما گہمی میں ہر آن قلا بازیاں کھاتے مناظر
——— ایک سے ایک متضاد کہ مجھ نگوڑی کی آنکھ کے سنہرے
ڈورے، نئی دلہن کی آنکھوں میں سرِ شام گہرے ہونے والے ڈوروں
کی طرح جیسے سلگ اٹھتے ہیں اور مجھے اپنی دودھیا روشنی میں سیاہی
کے فوارے ابلتے محسوس ہونے لگتے ہیں ——— معمولی سی باتیں لو
کہ ابھی بڑی بڑی چمکیلی کاریں فراٹے بھرتی، موٹے موٹے تندرست
لوگوں کو اڑائے لئے جا رہی ہیں کہ اسے وہ ایک بوڑھا لیرے لیرے
کپڑوں میں کمر جھکائے چلا آرہا ہے ——— ہانپ رہا ہے غریب
——— قدم اٹھانا دوبھر ہے، پر چلنا تو ہے ہی، اور کمبخت اوپر
سے خوانچہ سر پر لدا ہوا ہے ——— ریشمی ساریوں میں لپٹی، بالوں
میں پھول سجائے، چکنی چکنی جلد چمکاتی ہوئی عورتیں، یوں سڑک پر بکھری
ہوئی ہیں جیسے رنگ برنگے موتیوں کا ہار ٹوٹ کر بکھر گیا ہو۔ کہ وہ سامنے
کے مل سے مزدور عورتوں کا غول نکل کر سڑک پر پھیل گیا ———
میلے لبانڈے کپڑے، کالی مدقوق صورتیں ——— ایسی کہ دیکھ کر جی

جانے کیسا ہونے لگے ـــــــ ہوٹلوں میں لوگ باگ بیٹھے طرح طرح کے مزے دار کھانوں پر ہاتھ مار رہے ہیں کہ وہ سستے سے کلرک بابو کا زرد رُو بچہ میں میں شروع کر دیتا ہے، ماں اسے کھڑکی میں لئے کھڑی، سڑک پر دوڑتی ہوئی کاریں دکھا کر موٹر لے دینے کے وعدوں سے اُسے بہلا رہی ہے، کیونکہ بچہ بھوکا ہے، اور کنبہ بڑا ہے اور مہینے کی آخری تاریخیں ہیں، ان کے علاوہ اسی سڑک پر میں نے اور جانے کیا کیا دیکھا ـــــ ہزار قسم کے جلسے جلوس، ہڑتالیں، پولیس کا لاٹھی چارج، فوج کی گولیاں ـــــ قسم قسم کی ٹکریں، طرح طرح کے بیوپار یعنی موٹروں کی ٹکروں سے لے کر جوانیوں تک کی ٹکریں۔ جیوٹ کے بیوپار سے لے کر عصمتوں تک کا بیوپار ـــــ غرض کہ مانو، میں بہت کچھ دیکھ چکی ہوں۔

چلو بس رہنے بھی دو ـــــ بڑے انسان بنے بیٹھے ہو ـــــ ذرا دیکھو یہ سڑک پر کیا ہے؟ یہ بھی تو انسانوں ہی کے جسم ہیں۔ زخمی، مردہ، گردنیں کٹی، دست بریدہ، آنتیں نکلی، خون میں ڈوبے ہوئے جسم ـــــ ایک دو نہیں، سیکڑوں جسم ـــــ! خدا مجھے بتاؤ تو یہ جسم کس کے ہیں۔ کہہ دو، یہ ہندوؤں کے جسم ہیں، یہ مسلمانوں کے جسم ہیں اور یہ سکھوں کے ـــــ

ہنھ! اور جیسے یہ انسانوں کے جسم تو ہیں ہی نہیں ــــــ ہو تم پرلے سرے کے دھوکے باز ــــــ تم تو اپنے آپ کو بھی دھوکا دینے سے نہیں چوکتے ــــــ یہ تو وہی بات ہوئی کہ شکر کا شربت مختلف رنگ کی بوتلوں میں، بند کر کے شربت کو مختلف رنگوں کا بتایا جائے! اچھا بتاؤ تو یہ آسمان سے بجلی گری تھی، یا وبا پھیلی تھی یا طوفان آیا تھا ــــــ دیکھو جی! تم اس بات پر خدا کی طرف اشارہ نہ کرنا۔ ہاں! کیونکہ تمہاری عادت ہے کہ جب پکڑے جاؤ تو اپنی بدتمیزی چھپانے کے لئے بھولے پن سے آسمان تکنے لگتے ہو۔ بالکل ان بدتمیز لاڈلے بچوں کی طرح جو اپنا سارا اجھوہڑ پن ماں کے سر تھوپ دیتے ہیں۔

اور ہاں۔ یہ کیا ہے؟ یہ ــــــ جس پر میری روشنی کا دائرہ پڑ رہا ہے۔ یہ بھی تو ایک جسم ہی ہے نا؟ عورت کا جسم! برہنہ، خون میں لتھڑا ہوا جسم۔ کیوں بھئی یہ وہی جسم تو ہے نا جس کے بغیر کہتے ہیں تمہیں جنت بھی جہنم لگتی تھی ــــــ اسی کی خاطر تم نے دنیا میں آنا پسند کیا۔ یہ وہی جسم تو ہے نا جس سے لپٹ کر تم، اجاڑ دنیا، بھیانک دنیا کی تنہائیوں اور صعوبتوں کو بھول جاتے تھے، اور جس کے لئے تم نے اپنی قوتِ گویائی سے رنگین الفاظ کا ایک ذخیرہ کیا اور اپنے گیتوں کی پیاری پیاری لڑیوں میں پرو دیا ــــــ یہ وہی جسم تو ہے جسے

مظبوطی سے اپنانے کے لئے تم نے قانون وضع کئے اور نہ نظر آنے
والی زنجیریں ڈھال لیں ــــــ جسے اپنی ملکیت بنانے کے لئے
تم نے پتھروں اور چونے کی اونچی اونچی دیواریں اٹھائیں اور دروازوں
پر یہ لمبی لمبی زبانوں اور آتشبار آنکھوں کے پہرے بٹھائے ــــــ
اور جس جسم کو ادلتے بدلتے رہنے کے لئے تم نے قحبہ خانے کھولے،
قیمتیں مقرر کیں اور دھڑا دھڑ خرید و فروخت کی ــــــ جس کے
لئے تم اپنی کھڑکیوں، دروازوں اور پردوں کے پیچھے سے دھڑکتے ہوئے
دل کے ساتھ جھانکے، اور جب اس جسم تک تمہاری رسائی بہر طور
ہونے لگی تو سماج میں کاٹھ کے پہلوان کی طرح اکڑ گئے ــــــ
اور ہاں کیا یہ وہ جسم نہیں ہے جس کے اندر تم نے پرورش پائی
جس کی گرم چھاتی سے لگ کر تم نے زندگی کی حرارت اپنے حلق میں
نچوڑی ــــــ اور جس کی گود میں تم میٹھی نیندوں میں معصومیت
سے مسکرائے؟ انکار تو نہیں؟ تو یہ تمہاری محبوبہ کا جسم ہے، تمہاری
بیوی کا جسم ہے اور تمہاری ماں کا جسم ہے ــــــ ذرا دیکھو
تو اس ہولناک منظر میں جبکہ ہر طرف خون، تیزاب اور لاشیں
بکھری ہوئی ہیں، اور دُکھتی ہوئی خاموشی اندھیرے میں لپٹے
پنکھ پھیلائے ہوئے ہے ــــــ! میری روشنی کے دائرے

میں پڑا ہوا یہ جسم تمہیں کیسا لگ رہا ہے ـــــ اس کے سلونے سینے پر سے
گوشت کی تھرتھری چٹانیں تراش لی گئی ہیں اور بھری بھری رانوں کے درمیان
خنجر پیوست کر دیا گیا ہے ـــــ اور اس کے چہرے پر ایسے سیاہ بال بکھرے
ہوئے ہیں جن میں اکا دکا سفید بال بھی چمک رہے ہیں اور ان بالوں کے
نیچے ایک تھکی ہوئی محبوبہ اور ایک جی دار ماں اپنا چہرہ ڈھلکے ہوئے ہے
ـــــ شاید یہ یوں بڑی ہمتی شہادت دے رہی ہے کہ تم کس قدر
عورت پرست ہو ـــــ تم اپنی سیاست میں بھی اپنی ماں کا سینہ
نہیں بھولتے ۔ وہ سینہ جس سے تمہارے لئے زندگی کی حرارت گرم اور
شیریں دودھ کی صورت میں پھوٹتی ہے ـــــ اور نہ تم اپنی محبوبہ
کی رانوں کو اس موقع پر بخشتے ہو ـــــ ہا ہا! اُف تو یہ میرے
اندر جیسے جلتے ہوئے بے شمار قہقہے پیچ و تاب کھا رہے ہیں کیونکہ
مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تمہاری ساری عقلمندیاں۔ تمام فلسفیانہ عرب
دعوے جیسے کچی مٹی کے گیند کی طرح پھٹ سے ٹوٹ کر بکھر گئے ہیں
اور اب تم مجھے وہی بے وقوف سے انسان نظر آ رہے ہو جسے قدرت
نے اور جانداروں کی طرح جسم دے کر زمین پر پھینک دیا تھا ـــــ
میری بد روشنی کے دائرے میں پڑا ہوا برہنہ عورت کا لرزتا جسم مجھے
تمہارا ایک طعنہ نظر آ رہا ہے ـــــ ایک زبردست لیکن دبے ہوئے

——— الساتنا اور تیز طعنہ جس نے تم پر پڑے ہوئے اسارے لبادوں کے باوجود تمہیں ننگا کر دیا ہے ——— بالکل ننگا! ایک ننھے نادان بچے کی طرح جو ابھی ماں کی گود میں آنکھیں موندے، مٹھیاں بھینچے اس کی چھاتیاں پوری قوت اور وحشت سے جھنجھوڑ رہا ہو ———

چلو بس رہنے بھی دو ——— بڑے انسان بنے بیٹھے ہو ——— مارے اترا ہٹ ہی کے ٹھکانا نہیں ——— میں کہتی ہوں، تم تو سدا کے ایسے ہی ہو ——— یہ آج ہی تمہاری کارستانیاں رنگ نہیں لائیں۔ تم تو ازل سے کائنات کے لئے ایک خطرناک سازش کا وجود ہو ——— میرے حضور گوئے رنگ زاردں ہی میں اٹھتے ہیں ——— یہ آج کا احول یہ برہنہ عورت کی لاش، تمہارے لئے تنہا طعنہ تو نہیں ——— میں نے تو تم پر ازل سے بڑے بڑے دلچسپ طعنے چپکتے دیکھے ہیں، میں جب تمہیں صرف بادلوں میں چمکتی نظر آتی تھی، جب بھی میں نے تمہاری جھونپڑی کی جھریوں سے جھانک کر، تمہارے بے شمار روپ، تمہارے قسم قسم کے ارادے تمہارے چہرے پر لکھے دیکھے ہیں۔ سچ کہہ دوں تم تو پیاز کی ایک گٹھی کی طرح ہو کہ چھلکوں پر چھلکے اترتے جائیں پر آخر میں کچھ نہیں ———

سنو، میں تمہارے لئے ماضی کے گہرے اندھیرے میں جا کر آئینہ نہیں تلاش کرتی۔ اور نہ اس سڑک کے سوا کہیں کی بات کروں گی ——— ابھی چند

برس پہلے ہی کی بات تو ہے کہ اسی سڑک پر، اسی جگہ جہاں یہ برہنہ عورت
کی لاش پڑی ہوئی ہے، میں نے ایک اور لاش، ایک اور عورت کا نیم عریاں
جسم پڑا دیکھا تھا ——— وہ جسم بھی اسی جسم کی طرح تمہاری ہمہ گیر وحشت
اور بربریت کا شاہد تھا۔ میں بھول نہیں سکتی ——— وہ جسم اب بھی
میری آنکھ میں ریت کے ذرّے کی طرح کھٹکتا ہے۔ وہ جسم اب بھی اس جسم
کو ڈھکے جلتے ہوئے زخم کی طرح ہے اور تمہارے لئے وہ زخم اب بھی ایک
ایسا ہی طعنہ، جیسا کہ آج ایک اور طعنہ تمہارے سامنے ہے ——— لو
میں تمہیں اچھی طرح یاد دلائے دیتی ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب
اس سڑک پہ اور شہر کی ایسی ہی دوسری سڑکوں پہ بیمار، ننگے، کال
کے مارے لوگ ٹڈیوں کی طرح چھا گئے تھے۔ کہتے ہیں، ٹڈیاں جس کھیت
پہ گر جاتی ہیں اسے اجاڑ کر چھوڑتی ہیں۔ مگر یہ ایسی ٹڈیاں تھیں، جو تمہاری سڑکوں
کی گھاس تک کو نہ کھا سکیں ——— میں ہر رات جل جل کر دیکھتی کہ
فٹ پاتھوں کی قحط زدہ بستی میں موت کا فرشتہ، پھرتی سے اپنا
کام کرتا رہتا ——— سوکھے بچے، ماؤں کے سامنے ہچکیوں سے
زندگی کا تار توڑ دیتے اور ماؤں کی آنکھیں خشک رہتیں۔ شاید بھوک سے
ان کے جسموں کی رطوبتیں بھی خشک ہو چکی تھیں ——— شوہر بیویوں
کے سامنے مر جاتے اور بیویاں اپنا سہاگ لٹنے پر نہ روتیں، نہ بین کرتیں

جیسے ان دنوں ان کا سہاگ صرف ایک مٹھی چاول بن گیا تھا۔ —— سوکھے سہمے مردوں کے سامنے ان کی نیم برہنہ بیویاں، بیٹیاں اور بہنیں راہ چلتے مردوں کی ٹانگوں سے لپٹ لپٹ کر بھیک مانگتیں، مگر ان کے چہروں پر بھوک اتنی گہری تھی کہ غیرت کا رنگ ادھر پر کبھی نہ مارتا۔ وہ سڑک پر رینگ رینگ کر چلاتے رہتے۔ خدا کے لئے ایک مٹھی چاول، بھگوان کے نام پر چاول کے چند دانے، —— اور چاول سے پیٹ پالنے ہوئے خوش پوش لوگ ہنستے باتیں کرتے گزرتے چلے جاتے —— بعض تو قحط زدہ عورتوں میں حسن دجوانی ڈھونڈتے آنکھیں مارتے گزر جاتے اور گورے فوجی ایک لمحہ رک کر بھوکوں کے ہجوم کو یوں دیکھتے، جیسے سوچ رہے ہوں کہ ہندوستان میں تاج محل کے علاوہ بھی بعض چیزیں دیکھنے کے لائق ہیں۔ اور پیدل چلنے والے غریب لوگ بھوکوں کے ہجوم میں گھر کر ذرا کے ذرا بے بسی سے رُکتے اور پھر سر جھکا کر آگے بڑھ جاتے —— چاول اب مہنگا ہے —— بہت مہنگا! جیسے وہ بھوکوں کو سمجھا جاتے۔ مگر چاول کی مہنگائی کے خیال سے پیٹ تو نہیں بھرتا؟ شہر کے بازار میں محنت کی خرید بند تھی اور چاول فروخت ہوتا تھا۔ بہت مہنگا —— مگر تم تو خوب جانتے ہو کہ بھوک اپنی شدت کو دبانے کے لئے کیا کچھ نہیں کرتی، تم بھی میں بھی کیل ٹھونکنے کی کوشش کرتی ہے نا! ——

میں نے دیکھا۔ کہ بھوک نے ایک سکہ چلانا شروع کر دیا۔ گوشت اور پوست کا سکہ! ماں، بہن، بیوی، بیٹی اور محبوبہ بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر گئیں اور چاول چالاک رنڈی کی طرح تمہاری روح کو چھاپ کر بیٹھا رہا مگر تم ہی تو کہتے ہو کہ رنڈی کا اعتبار ہی کیا؟ آج یہاں کل وہاں ——— اسکے سڑکوں پر پڑا پھرنے لگا اور چاول بازار سے غائب۔ ———

"ایک نوالہ چاول۔ خدا کے نام پر، بھگوان کے نام پر۔ آوازیں کورس میں چلاتیں۔ لوگ جھنجھلائے ہوئے سے گزر جاتے، کیونکہ چاول نہیں تھا۔ بازار میں تو نہیں تھا اور شہر میں بھوک کے علاوہ بیماریاں پھیل رہی تھیں

ہم چاول لا رہے ہیں برما کا چاول" ایک آواز فضا میں گونجی۔

——— اور ذرا سنو تو انہی دنوں ایک رات کے سناٹے میں ایک ٹک میری روشنی تلے بگھی کھڑی ہوئی۔ میری روشنی نے اندر جھانک کر دیکھا۔ دونوں کار کی پچھلی نشست پر ملے رکھے ہوئے تھے

مولانا اگر برما کا چاول آگیا تو بنگال کا لاکھوں من چاول میرے اور تمہارے تہ خانوں میں پڑے پڑے سڑ جائے گا" ایک توند کے منہ سے آواز آئی

"اجی نہیں لالہ جی۔ ہنوز دلی دور است۔ خدا بلیک مارکیٹ کو سلامت رکھے ہمارا چاول اس وقت تک سو گنا نفع دے چکے گا" دوسرے توند کے گنبد نے جواب دیا ——— اور داڑھی اور چوٹی کی سانٹھ گانٹھ

لئے موٹر غرور سے آگے بڑھ گئی۔ اور سڑک کے دوسری طرف ہندو ریلیف کمیٹی اور مسلم ریلیف کمیٹی کے دفتروں کے سائن بورڈ ایک دوسرے سے تنے تنے لٹکے ہوئے تھے اور فٹ پاتھوں کی قحط زدہ بستی میں موت کا فرشتہ خدا اور بھگوان کے نام لیواؤں کی روح میں بے صبری سے اپنے دامن میں سمیٹ رہا تھا۔

"ہم برما کا چاول لا رہے ہیں" بھوک سے سسکتے ہوئے دھرتی کے بچوں کو مژدہ ملا اور آخر کار فضلے سے اٹے چاول برسنے لگے فاشست کھیتی کی بہترین کاشت! بھوکے مایوس ہو گئے۔ کیونکہ وہ ان چاولوں کو ہضم نہیں کر سکتے تھے بلکہ یہ چاول انہی کو ہضم کر رہے تھے۔

ہاں، تو بات کچھ لمبی ہو گئی، مگر میں چاہتی تھی کہ تمہیں وہ دن بخوبی یاد دلاؤں —— تو یہ انہی دنوں کی بات ہے جب بلیک آؤٹ اور بلیک مارکیٹ کے دور دورے میں لاکھوں انسان تمہاری سڑکوں پر مر چکے تو ایک موقع ایسا آیا کہ میں تمام رات بڑی شدت سے تمہارے بارے میں سوچتی رہی۔ تم جو میرے آقا ہو —— تم جو کائنات کی ہر قوت پر قابض ہونے کے لئے اس طرح بے چین رہتے ہو، جس طرح آپس میں ایک دوسرے پر قابض ہونے کو ——

اس رات اس لڑکی کی لاش میرے کھمبے کے قدموں میں پٹکا ہوئی

تھی جسے میں ایک مدت سے جانتی تھی ــــــ اس روشنی کے دائرے میں جہاں آج بھی ایک لاش پڑی ہے ــــــ

وہ بھی ان ہزاروں قحط زدہ لڑکیوں کی طرح ایک لڑکی تھی جو عام طور سے قرب و جوار کے دیہات سے اپنے اجاڑ کھیت روند کر اپنے کنبوں کے ہمراہ چاول کی تلاش میں نکل کر شہر کی سڑکوں پر پھیل گئی تھیں ــــــ

اس کے ساتھ اس کی ماں، چھوٹا بھائی اور باپ تھے ــــــ جس دن یہ مختصر کنبہ، اس فٹ پاتھ پر آیا تو باپ کے کندھے پر بیٹے کی سوکھی ہڈیاں تھیں جن میں روح بجھ رہی تھی۔ اس رات چپکے سے کسی وقت، وہ اپنی گدڑی پر مر گیا۔ اور وہ تین رہ گئے۔ باپ جو اپنی بڑھی ہوئی داڑھی اور مونچھوں کو کھسوٹتا رہتا۔ ماں۔ جو ہر وقت آسمان سے لو لگائے رہتی اور بیٹی جو ایک طرف چپ چاپ بیٹھی سڑک پر آنے جانے والوں کو تکا کرتی یونہی بڑی عجیب عجیب سی نظروں سے۔ جیسے وہ ان سب سے مایوس ہو چکی ہو ــــــ اس کے سلونے چہرے پر ایک قسم کی حقارت ڈوبتی ابھرتی رہتی اور بڑی بڑی پیاری سی آنکھیں جیسے درد سے مندی مندی سی رہتیں۔ اس کی پتلی سی ٹھوڑی اس کے گھٹنوں پر رکھی رہتی اور دُبلے دُبلے ہاتھ پنڈلیوں کے گرد حلقہ بنائے رہتے ــــــ رات کے جوان ہوتے ہی وہ اپنے ماں باپ کو بھوک کی بے چینی میں جاگتا چھوڑ کر، اسی سڑک پر کہیں کھو جاتی اور پھر صبح ہوتے واپس آکر

ماں کو جگاتی اور اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر اپنی مٹھی چپکے سے کھول دیتی ــــ
رات بھر کی جگائی کے بعد جب میں دن کی روشنی میں اپنی آنکھ موندنے لگتی، تو
دیکھتی کہ وہ بھی اپنی گدڑی میں سکڑی سو رہی ہے، بالکل اس معصوم بچے کی
طرح جو اپنی کسی ضد پر پٹ کر روتے روتے سو گیا ہو ــــــ! لیکن
تھوڑے دن بعد اس کا معمول اکثر بدلنے لگا - اب کبھی کبھی وہ واپسی
میں چپ چاپ آکر ماں کے پاس لیٹ رہتی - اس کی مٹھی بند نہ ہوتی اور ماں
اس کی جامہ تلاشی لیتی ــــــ اور جب کچھ حاصل نہ ہوتا تو آسمان کی طرف
تکنے لگتی اور باپ کروٹ بدل کر اپنی داڑھی مونچھوں کے بے تحاشہ بڑھے
ہوئے بال اس طرح نوچتا جیسے وہ ان سے عاجز ہو ــــــ پھر میں
نے ایک دن محسوس کیا کہ وہ چلنے میں جیسے سخت اذیت محسوس کرنے
لگی ہے - وہ آہستہ آہستہ ٹانگیں گھسیٹ گھسیٹ کر چلتی مگر
پھر بھی وہ ہر رات غائب رہ کر صبح ہوتے ہانپتی، کانپتی واپس آ
جاتی ــــ اس کے ماں باپ اس سے خفا خفا سے رہتے اور دن
بھر دردناک صدائیں لگا کر بھیک مانگا کرتے، اور جب انہیں کچھ
مل جاتا تو وہ زیادہ سے زیادہ کوشش کرتے کہ خود کھالیں اور بیٹی
کو کچھ نہ دیں، کیونکہ انکی آنکھوں میں یہ شبہ ہر وقت ناچتا تھا کہ ان
کی بیٹی ان کی محتاج نہیں ہے - اور وہ ان سے نفرت کرتی ہے -

جس رات کا میں ذکر کر رہی ہوں، اس رات وہ صبح ہونے سے
بہت پیشتر، بری طرح جھومتی، لڑکھڑاتی واپس آ گئی۔ ـــــ اُس کی
بڑی بڑی دردناک آنکھوں میں وحشت اور نفرت کے سانپ جیسے
پھنپھنا رہے تھے، اور وہ بے حیائی سے ہنس رہی تھی اُس کا روز بروز
دبلا اور کمزور ہوتا ہوا جسم آج ضرورت سے زیادہ سوکھا ہوا لگ رہا
تھا ـــــ وہ لڑکھڑا کر اپنی ماں پر گر پڑی ـــــ ماں باپ ہڑ
بڑا کر اٹھ بیٹھے ـــــ وہ حیرتناک سکوت میں ڈوبے ہوئے تھے
اور وہ برابر ہنسے جا رہی تھی۔ اور نیم تاریکی میں جیسے کچھ تلاش کر
رہی تھی ـــــ

پھر وہ بکنے لگی ـــــ "اب کی ہمارے کھیتوں میں چاول کی
بجائے رنڈیاں اُگی ہیں۔ ـــــ پہلے ہمارا چاول تمہارے شہر میں
آتا تھا، اب کی رنڈیاں آئی ہیں ـــــ ہو ہو ہو" ـــــ
جھوم کر ہنسی۔

بھوک دلال ہے اور تم جانو کبھی کبھی رنڈی اپنے دلال سے
بھی نفرت کرنے لگتی ہے ـــــ مجھے پیسے نہ دو۔ مجھے دو گھونٹ
شراب۔ اور پلا دو بالوجی میں اپنے دلال سے اُکتائی ہوئی ہوں میں بھی
اپنی مرضی سے عیش کرنا چاہتی ہوں ـــــ ہو ہو اؤ ہو اؤ ـــــ" وہ

اور جانے کیا کیا بکے جارہی تھی۔

"تو نے شراب پی ہے ——؟ جبھی تو ہمیں اب پیسے نہیں دیتی"
ماں اچانک سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔

"کمینی بے حیا رنڈی!" باپ کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔

"میرا کوئی نہیں، رنڈی کا کوئی نہیں ہوتا —— ہو ہو ——"
وہ بھیانک انداز میں ہنستے ہوئے بڑبڑائی —— باپ نے غصے میں اس کے جسم پر تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش کر دی اور ماں اس کے کپڑے کھسوٹنے لگی۔ شاید وہ اس وقت بھی پیسے تلاش کر رہی تھی —— وہ زمین پر گھسٹتی ہوئی ان کی مارپیٹ اور نوچ کھسوٹ کی زد سے بچنے لگی —— یہاں تک کہ اس کا سر بیرے کھمبے سے ٹکرایا اور وہ زمین پر پڑ گئی لیکن وہ اب بھی ہنس رہی تھی —— اس کے کھلے ہوئے پیٹ بازوؤں اور پنڈلیوں پر بڑی بڑی سرخ کھپنیاں دمک رہی تھیں۔ اچانک اس نے پڑے پڑے قے کی اور پھر اپنا سر ڈھلکا دیا —— اس کے ماں باپ غصے میں اسے گالیاں کوسے دے رہے تھے اور اس کی دبی دبی سانسوں میں ہنسی ہچکولے سے کھا رہی تھی —— اس کے بعد وہ اچانک چپ ہو گئی، اس کی سانس رک گئی لیکن اس کے دانت اب بھی کھلے ہوئے تھے، جیسے وہ ہنس رہی ہو —— اس کے بیاہ۔

بالوں کی لٹیں اُلجھی ہوئی شراب میں بھیگ رہی تھیں ـــــ یہ دیکھ کر اس کے
ماں باپ رونے لگے ـــــ اِدھر اُدھر سے کئی اور بھو کے ان کے رونے
کی آواز پر رینگ آئے، میری روشنی میں ان کی آنکھوں میں ایسی ہی آپ
بیتیاں جیسے دمکنے لگیں، اور وہ نیم تاریکی میں اِدھر اُدھر خاموشی سے گھورنے
لگے۔ جیسے وہ دیکھ رہے ہوں، کہ اُن کا دشمن کون ہے؟ کہاں چھپا بیٹھا
ہے؟ ـــــ لیکن لڑکی کی نیم وا آنکھیں ایسی مطمئن تھیں جیسے انھیں
جواب مل گیا ہو، اور اس کے کمزور بے جان چہرے پر اس کی تلخ ہنسی
گویا مرتسم ہو کر رہ گئی تھی۔ رات گزرتی رہی اور میں جل جل کر سوچتی
رہی کہ ہزاروں عصمتوں، بے شمار غیرتوں اور لاکھوں جسموں کی موت
کا ذمّہ دار کون ہے؟ ان کا دشمن کون ہے؟ میرے کانوں میں
مختلف جواب گونجے۔ گوری حکومت، غیر ملکی حملہ آور اور ذخیرہ اندوز
ـــــ لیکن ہر جواب پر تمہارا، ابنِ آدم کا ہیولا، اچانک بلّی کے
پنجوں کی طرح خراشیں ڈال دیتا، اور مجھے جواب ملتا کہ ان سب کا دشمن
انسان ہے، صرف انسان! ـــــ

ناک بھوؤں نہ چڑھاؤ تم ـــــ ذرا مجھے بتاؤ تو کہ کیا گوری حکومت
زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑوں کی تھی؟ کیا غیر ملکی حملہ آور ستّے البولوں پر
جھکنے والے پرندے تھے اور تمہارے ملک کے ذخیرہ اندوز کیا کھوتے

بند ھنے والی بھینسیں تھیں، اور ان دونوں نوجوان عورتوں کی عصمتیں خریدنے والے کیا ریت کے ذرّے تھے ؟ ـــــ

اچھا چلو، تم کہتے ہو تو میں مانے لیتی ہوں کہ وہ غیر ملکی حملہ آور فاشست تھے، اور دنیا کے لئے تباہی کا پیغام لائے تھے، اور ذخیرہ اندوز انسان سے زیادہ سرمایہ دار تھے۔ اور گوری بدیسی حکومت ظلم کا دوسرا نام ہے، مگر اب یہ منظر میرے سامنے ہے ـــــ گردنیں کٹی، آنتیں نکلی، ہاتھ بریدہ خون میں نہائے ہوئے جسم ـــــ ایک دو نہیں سیکڑوں! تیزاب اور بارود کی بو میں بسی ہوئی لاشیں، اور خصوصاً یہ لاش جو عین میری روشنی کے دائرے میں پڑی ہوئی ہے، برہنہ عورت کی لاش، جسکا سینہ نہایت چابکدستی سے ہموار کیا گیا ہے اور جس کی رانوں میں چھرا اسی شان سے پیوست ہے جس شان سے کولمبس نے نئی دنیا کی زمین پر اپنا پرچم نصب کیا ہوگا ۔ یہ دریافت کسی اور کی نہیں ہزاروں سال اکٹھا رہنے والے پڑوسی کی ہے ـــــ

ہٹو چلو بس رہنے بھی دو ـــــ بڑے انسان بنے بیٹھے ہو، ہاں نہیں تو لیکے لگے رعب جمانے ـــــ مجھے آنکھیں نہ دکھاؤ ـــــ وہی بات کہ میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو! بھئی صاف بات تو یہ ہے کہ کوئی جیسا دیکھے گا ویسا ہی کہے گا۔ اور تم نے مجھے کون سے بڑے سکھ دیئے

ہیں جو میں تمہاری للو تپو کروں اور تمہارے ننگے کھلے پر اپنا آنچل ڈالتی پھروں
—— میں نے اس سڑک کے سوا کہیں اور کی کوئی بات نہیں کی، اور نہ ماضی
کے گہرے اندھیرے میں گئی —— لو اب تم خود اتنی باتوں سے سوچ
لو کہ تم کیا ہو؟ بڑے عقلمند بنتے ہو بڑے تیز نظر آتے ہو، ایسے کہ اپنا
منہ کھسوٹتے میں بھی عار نہیں —— آنکھیں بند کئے بس دوڑے جا رہے
ہو، اپنے حساب ترقی کی طرف، اور حال یہ ہے کہ ایک ہی دائرے میں
چکر کاٹ رہے ہو، اور کمبخت ترقی ہے کہ دور کھڑی پیاسی نظروں سے
تمہیں ٹکر ٹکر تک رہی ہے —— اور تمہارے اس دائرے میں ہے کیا؟
دسنو! اس میں خونچکاں عالمگیر جنگیں ہیں کٹھ پتلیوں کے کھیلوں جیسی
کانفرنسیں ہیں —— غلامیاں ہیں، ایسی آزادیاں ہیں، جن میں صرف
چند ہی لوگ آزاد رہتے ہیں اور ایسے عوام ہیں، جو زندگی بھر آوارہ کتوں
کی طرح سماج کے برسر اقتدار طبقے کے اشاروں پر ایک دوسرے کو بھنبھوڑتے
رہتے ہیں، لیکن ان سب کی ضرورتیں ایک ہیں، ان کے دکھ ایک ہیں،
ان کی زندگیاں ایک دوسرے سے مماثل ہیں اور موت بھی —— اور تمہاری
جیسی ایک اور مخلوق ہے جسے تم عورت کہتے ہو —— کہا جاتا ہے کہ
انسان کا یہ جوڑا سدا سے ہے اور سدا رہے گا —— لیکن یہ مخلوق آج
بھی تمہاری دنیا میں ایک کھلونا ہے۔ ایک سکہ ہے۔ ایک ایسا گہنا ہے

جس پر تم اپنی فطرت کی ہر گندگی اچھال دیتے ہو —— اور پھر اس دائرے کے اندر کھڑے ہو کر، تم کہتے ہو کہ میں انسان ہوں۔ میں اشرف المخلوقات ہوں اور میں خلیفۃ اللہ ہوں ——!

انوہ بھئی!!

اس اندھیری رات کے بوجھل سنّاٹے میں تم نے مجھے کیا کچھ نہیں یاد دلا دیا، تم نے میری بینائی کو اعلیٰ کے ان خونیں سمندروں میں غوطے مارنے پر مجبور کر دیا، جن میں بے شمار سوکھے، سڑے پنجر سیپوں کی طرح چکرا رہے ہیں، اور لاتعداد کراہوں اور چیخوں کا شور ہیبت ناک موجیں بنکر فطرت کے ساحل سے سر ٹکرا رہا ہے —— اُف! میں کہتی ہوں کہ میری روشنی کے دائرے میں پڑی ہوئی برہنہ عورت کی لاش، یہاں سے اٹھالے جاؤ —— کیونکہ مجھے اس کے خون کے ایک ایک قطرے میں تمہاری انسانیت، دانت کچکچاتی اور اپنی خون آلود انگلیاں چاٹتی نظر آرہی ہے —— اس لاش کے ایک ایک زخم میں تمہاری تہذیب اور تمہارا تمدّن۔ اِترا رہا ہے کیونکہ تمہارے تمدّن کا کمال اندھی خونریزیوں میں ہے۔ اور اب تمہارے ہاں ذرّے سے جہنم پیدا کرنے کی ترکیبیں ہو رہی ہیں، اور ہوا میں آگ لگانے کی تجویزیں سوچی جا رہی ہیں اور ستاروں کو عجائب گھروں میں اتار لینے کے مشورے ہو رہے ہیں —— نہ جانے مجھے تمہارا تمدّن کیا

کیا دکھائے گا، اس لئے، تم اس لاش کو، اپنے تمدن کی ترقی کے اس شاہکار کو یہاں سے اٹھا لے جاؤ، اور جاتے جاتے مجھے ایک پتھر کا نشانہ بناتے جاؤ، تاکہ مجھے اس کوفت سے نجات مل جائے کہ میں اندھوں کے گھر کی روشنی ہوں ———

ارے! تم میں اتنا حوصلہ بھی نہیں کہ میری روشنی کی چنگاری کو ختم کرتے جاؤ ——— اور یہ جو تم نے کائنات کے تجلی زار بجھا ڈالے ہیں:

چلو بس رہنے بھی دو ——— تم سے انسان بنے بیٹھے ہو!

۱۹۴۶ء